Registered No. L. 4186

جلد ١٥ — عدد ٦

ذی الحجہ ١٣٥٨ھ

٤٨٦

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہٗ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ مر

قیمت سالانہ صہ

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مُسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ھے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ھے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ھے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ھیں، ان کا جواب کیا ھے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ھیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	محصول ڈاک
آٹھ آنے فی جلد	ایک روپیہ آٹھ آنے	ایک روپیہ چار آنے	تین آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)

پَردَہ

اجتماعی اور شرعی نقطۂ نظر سے

از

ابوالاعلیٰ مودودی

فہرست مضامین

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ مبارک پارک سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

پردے کے مسئلہ پر اب سے چار سال پہلے میں نے ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا جو ترجمان القرآن کے کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت بحث کے بعض گوشے قصداً نظر انداز کر دیئے گئے تھے، اور بعض کو تشنہ چھوڑ دینا پڑا تھا، کیونکہ کتاب کے بجائے محض ایک مضمون ہی لکھنا مدنظر تھا۔ اب ان اجزاء کو یکجا کر کے ضروری اضافوں اور تشریحات کے ساتھ یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ دعویٰ اب بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اس موضوع پر آخری چیز ہے، لیکن میں کم سے کم یہ توقع ضرور رکھتا ہوں کہ جو لوگ اس مسئلے کو واقعی سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس میں بڑی حد تک اطمینان بخش مواد اور دلائل پائیں گے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

ابوالاعلیٰ

۲۲ محرم ۱۳۵۹ھ

نوعیت مسئلہ

انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے دو ہیں، جنکے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح و ترقی کا انحصار ہے اور جنکو حل کرنے میں قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک دنیا کے حکما و عقلا پریشان و سرگرداں رہے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں عورت اور مرد کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے، کیونکہ یہی تعلق دراصل تمدن کا سنگِ بنیاد ہے، اور اسکی نزاکت کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں ذراسی بھی کجی آجائے تو

تا ثریا می رود دیوار کج

اور دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے جس کا تناسب قائم کرنے میں اگر ذراسی بے اعتدالی بھی باقی رہ جائے تو صدیوں تک عالم انسانی کو اسکے تلخ نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔

ایک طرف ان دونوں مسائل کی اہمیت کا یہ حال ہے، اور دوسری طرف انکی پیچیدگی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک فطرت کے تمام حقائق پر کسی کی نظر پوری طرح حاوی نہ ہو وہ انکو حل نہیں کرسکتا۔ سچ کہا تھا جس نے کہا تھا کہ انسان ایک عالم اصغر ہے۔ اُس کے جسم کی ساخت، اُسکے نفس کی ترکیب، اس کی قوتیں اور قابلیتیں، اُسکی خواہشات، ضروریات اور جذبات و احساسات، اور اپنے وجود سے باہر کی بیشمار اشیاء کے ساتھ اسکے فعلی اور انفعالی تعلقات، یہ سب چیزیں ایک دنیا کی دنیا اپنے اندر رکھتی ہیں۔ انسان کو پوری طرح سمجھا نہیں جاسکتا جب تک کہ اس دنیا کا ایک ایک گوشہ نگاہ کے سامنے روشن نہ ہو جائے اور انسان کی زندگی کے بنیادی مسائل حل نہیں کیے جاسکتے جب تک کہ خود انسان کو پوری طرح سمجھ نہ لیا جائے

یہی وہ پیچیدگی ہے جو عقل و حکمت کی ساری کاوشوں کا مقابلہ ابتدا سے کر رہی ہے اور آج تک کیے جا رہی ہے۔ اول تو اس دنیا کے تمام حقائق ابھی تک انسان پر کھلے ہی نہیں ہیں۔ انسانی علوم میں سے کوئی علم بھی ایسا نہیں جو کمال کے آخری مرتبہ پر پہنچ چکا ہو، یعنی جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہو کہ جتنی حقیقتیں اس شعبۂ علم سے تعلق رکھتی ہیں ان سب کا اس نے احاطہ کر لیا ہے۔ مگر جو حقائق روشنی میں آچکے ہیں انکی وسعتوں اور باریکیوں کا بھی یہ عالم ہے کہ کسی انسان کی، بلکہ انسانوں کے کسی گروہ کی نظر بھی اُن سب پر بیک وقت حاوی نہیں ہوتی۔ ایک پہلو سامنے آتا ہے اور دوسرا پہلو نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ کہیں نظر کوتاہی کرتی ہے اور کہیں شخصی رجحانات حجاب نظر بن جاتے ہیں۔ اس دوہری کمزوری کی وجہ سے انسان خود اپنی زندگی کے ان مسائل کو حل کرنے کی جتنی تدبیریں بھی کرتا ہے وہ ناکام ہوتی ہیں اور تجربہ آخر کار اُنکے نقص کو نمایاں کر دیتا ہے۔ صحیح حل صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ نقطۂ عدل کو پا لیا جائے، اور نقطۂ عدل پایا نہیں جاسکتا جب تک کہ تمام حقائق نہ سہی، کم از کم معلوم حقائق ہی کے سارے پہلو یکساں طور پر نگاہ کے سامنے نہ ہوں۔ مگر جہاں منظر کی وسعت بجائے خود اتنی زیادہ ہو کہ بینائی اس پر چھا نہ سکے، اور اسکے ساتھ نفس کی خواہشات اور رغبت و نفرت کے میلانات کا یہ زور ہو کہ جو چیزیں صاف نظر آتی ہوں انکی طرف سے بھی خود بخود نگاہ پھر جائے، وہاں نقطۂ عدل کس طرح مل سکتا ہے؟ وہاں تو جو حل بھی ہوگا اس میں لامحالہ یا افراط پائی جائیگی یا تفریط۔

اوپر جن دو مسائل کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں سے صرف پہلا مسئلہ اس وقت ہمارے سامنے زیر بحث ہے۔ اس باب میں جب ہم تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو افراط اور تفریط کی کھینچ تان کا ایک عجیب سلسلہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت جو ماں کی حیثیت سے آدمی کو جنم دیتی اور بیوی کی حیثیت سے زندگی کے ہر نشیب و فراز میں مرد کی رفیق رہتی ہے، خادمہ بلکہ لونڈی کے مرتبے میں رکھ دی گئی ہے، اس کو بیچا اور خریدا جاتا ہے، اسکو ملکیت اور وراثت کے تمام حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے

اس کو گناہ اور نجاست اور ذلت کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کی شخصیت کو اُبھرنے اور نشوونما پانے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ دوسری طرف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ وہی عورت اٹھائی اور ابھاری جا رہی ہے مگر اس شان سے کہ اُسکے ساتھ بداخلاقی اور بدنظمی کا ایک طوفان بھی اٹھ رہا ہے، وہ حیوانی خواہشات کا کھلونا بنائی جاتی ہے، اسکو واقعی شیطان کی ایجنٹ بنا کر رکھدیا جاتا ہے، اور اسکے ابھرنے کے ساتھ انسانیت کے گرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان دونوں انتہاؤں کو ہم محض نظری حیثیت ہی سے افراط اور تفریط کے ناموں سے موسوم نہیں کرتے بلکہ تجربہ جب اُنکے مُضر نتائج کا پورا ریکارڈ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیتا ہے تب ہم اخلاق کی زبان میں ایک انتہا کو افراط اور دوسری کو تفریط کہتے ہیں۔ تاریخ کا یہی منظر جسکی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، ہم کو یہ بھی دکھاتا ہے کہ جب ایک قوم وحشت کے دور سے نکل کر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھتی ہے تو اسکی عورتیں لونڈیوں اور خدمتگاروں کی حیثیت سے اسکے مردوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ابتدا میں بدویانہ طاقتوں کا زور اسے آگے بڑھائے لیے جاتا ہے، مگر تمدنی ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے پورے نصف حصہ کو پستی کی حالت میں رکھ کر وہ آگے نہیں جاسکتی۔ اس کو اپنی ترقی کی رفتار رکتی نظر آتی ہے اور ضرورت کا احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ اس نصف ثانی کو بھی نصف اول کے ساتھ چلنے کے قابل بنائے مگر جب وہ اس نقصان کی تلافی شروع کرتی ہے تو صرف تلافی پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ عورت کی آزادی سے خاندانی نظام (جو تمدن کی بنیاد ہے) منہدم ہو جاتا ہے، عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے، شہوانیت اور عیش پرستی پوری قوم کے اخلاق کو تباہ کر دیتی ہے، اور اخلاقی تنزل کے ساتھ ساتھ ذہنی، جسمانی اور مادی قوتوں کا تنزل بھی لازمی طور پر رونما ہوتا ہے جس کا آخری انجام ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ تاریخ سے اسکی مثالیں زیادہ تفصیل کے ساتھ دی جاسکیں،

مگر توضیح مدعا کے لیے دو چار مثالیں ناگزیر ہیں۔

یونان اقوام قدیمہ میں سے جس قوم کی تہذیب سب سے زیادہ شاندار نظر آتی ہے وہ اہل یونان ہیں۔ اس قوم کے ابتدائی دور میں اخلاقی نظریہ، قانونی حقوق، اور معاشرتی برتاؤ ہر اعتبار سے عورت کی حیثیت بہت گری ہوئی تھی۔ یونانی خرافیات (Mythology) میں ایک خیالی عورت پانڈورا (Pandora) کو اسی طرح تمام انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا جس طرح یہودی خرافیات میں حضرت حوا علیہا السلام کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت حوا کے متعلق اس غلط افسانے کی شہرت نے عورت کے بارے میں یہودی اور مسیحی اقوام کے رویہ پر جو زبردست اثر ڈالا ہے اور قانون، معاشرت، اخلاق، ہر چیز کو جس طرح متاثر کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ قریب قریب ایسا ہی اثر پانڈورا کے توہم کا یونانی ذہن پر بھی ہوا تھا۔ ان کی نگاہ میں عورت ایک ادنیٰ درجہ کی مخلوق تھی۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اس کا مرتبہ گرا ہوا رکھا گیا تھا، اور عزت کا ہر مقام مرد کے لیے مخصوص تھا۔

تمدنی ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں یہ طرز عمل تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ برقرار رہا۔ تہذیب اور علم کی روشنی کا صرف اتنا اثر ہوا کہ عورت کا قانونی مرتبہ تو جوں کا توں رہا، البتہ معاشرت میں اس کو نسبتہً ایک بلند تر حیثیت دیدی گئی۔ وہ یونانی گھر کی ملکہ تھی۔ اس کے فرائض کا دائرہ گھر تک محدود تھا اور ان حدود میں وہ پوری طرح با اقتدار تھی۔ اُس کی عصمت ایک قیمتی چیز تھی جس کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شریف یونانیوں کے ہاں پردے کا رواج تھا۔ ان کے گھروں میں زنانخانے مردانخانوں سے الگ ہوتے تھے۔ ان کی عورتیں مخلوط محفلوں میں شریک نہ ہوتی تھیں، نہ منظرِ عام پر نمایاں کی جاتی تھیں۔ نکاح کے ذریعہ سے کسی ایک مرد کے ساتھ وابستہ ہونا عورت کے لیے شرافت کا مرتبہ تھا اور اسی کی عزت تھی، اور بیسوا بن کر رہنا اس کے لیے ذلت کا موجب سمجھا جاتا تھا۔ یہ اس زمانہ کا حال تھا جب یونانی قوم خوب طاقتور تھی اور پورے زور کے ساتھ عروج و ترقی کی طرف جا رہی تھی۔ اس دور میں اخلاقی خرابیاں ضرور موجود

تھیں مگر ایک حد کے اندر تھیں - یونانی عورتوں سے اخلاق کی جس پاکیزگی اور طہارت و عصمت کا مطالبہ کیا جاتا تھا اس سے مرد مستثنیٰ تھے - اُن سے نہ اس کا مطالبہ تھا اور نہ اخلاقاً کسی مرد سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ پاک زندگی بسر کریگا - بیسوا طبقہ یونانی معاشرت کا ایک غیر منفک جزء تھا، اور اس طبقہ سے تعلق رکھنا مردوں کے لیے کسی طرح معیوب نہ سمجھا جاتا تھا -

رفتہ رفتہ اہل یونان پر نفس پرستی اور شہوانیت کا غلبہ شروع ہوا اور اس دور میں بیسوا طبقہ کو وہ عروج نصیب ہوا جسکی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی - رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائیٹی کے ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا - فلاسفہ، شعرا، مورخین، اہل ادب اور ماہرین فنون، غرض تمام سیارے اسی آفتاب کے گرد گھومتے تھے - وہ نہ صرف علم و ادب کی محفلوں کی صدر نشین تھی، بلکہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اسی کے حضور میں طے ہوتے تھے - قوم کی زندگی و موت کا فیصلہ جن مسائل کے ساتھ وابستہ تھا ان میں اُس عورت کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی جسکی دو راتیں بھی کسی ایک شخص کے ساتھ وفاداری میں بسر نہ ہوتی تھیں - یونانیوں کے ذوق جمال اور حسن پرستی نے ان کے اندر شہوانیت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکایا - وہ اپنے اس ذوق کا اظہار جن مجسموں (یا "آرٹ" کے عریاں نمونوں) میں کرتے تھے وہی انکی شہوانیت کو اور زیادہ ہوا دیتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ اُنکے ذہن سے یہ تصور ہی محو ہو گیا تھا کہ شہوت پرستی بھی کوئی اخلاقی عیب ہے - ان کا معیار اخلاق اتنا بدل گیا تھا کہ بڑے بڑے فلاسفہ اور معلمین اخلاق بھی زنا اور فحش میں کوئی قباحت اور کوئی چیز قابل ملامت نہ پاتے تھے - عام طور پر یونانی لوگ نکاح کو ایک غیر ضروری رسم سمجھنے لگے تھے اور نکاح کے بغیر عورت اور مرد کا تعلق بالکل معقول سمجھا جاتا تھا جسکو کسی سے چھپانے کی ضرورت نہ تھی - آخر کار ان کے مذہب نے بھی ان کی حیوانی خواہشات کے آگے سپر ڈال دی - "کام دیوی" (Aphrodite) کی پرستش تمام یونان میں پھیل گئی جسکی داستان انکے خرافیات میں یہ تھی کہ ایک دیوتا کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے تین

مزید دیوتاؤں سے آشنائی کر رکھی تھی، اور اسکے ماسوا ایک فانی انسان کو بھی اسکی جناب میں سرفرازی کا فخر حاصل تھا۔ اسی کے بطن سے محبت کا دیوتا کیوپڈ پیدا ہوا جو ان دیوی صاحبہ اور انکے ایک غیر قانونی دوست کی باہمی لگاوٹ کا نتیجہ تھا۔ یہ اُس قوم کی معبودہ تھی، اور اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو قوم ایسے کیرکٹر کو نہ صرف مثال (آئیڈیل) بلکہ معبودیت تک کا درجہ دے دے اسکے معیار اخلاق کی پستی کا کیا عالم ہوگا۔ یہ اخلاقی انحطاط کا وہ مرتبہ ہے جس میں گرنے کے بعد کوئی قوم پھر کبھی نہ ابھر سکی۔ ہندوستان میں بام مارگ اور ایران میں مزدکیت کا ظہور اسی انحطاط کے دور میں ہوا۔ بابل میں بھی قحبہ گری کو مذہبی تقدس کا درجہ اسی زمانہ میں حاصل ہوا جس کے بعد پھر دنیا نے کبھی بابل کا نام افسانۂ ماضی کے سوا کسی دوسری حیثیت سے نہ سُنا۔ یونان میں جب کام دیوی کی پرستش شروع ہوئی تو قحبہ خانہ عبادت گاہ میں تبدیل ہوگیا۔ فاحشہ عورتیں دیوداسیاں بن گئیں اور زنا ترقی کرکے ایک مقدس مذہبی فعل کے مرتبہ تک پہنچ گئی۔

اسی شہوت پرستی کا ایک دوسرا مظہر یہ تھا کہ یونانی قوم میں عملِ قومِ لوط ایک وبا کی طرح پھیلا اور مذہب و اخلاق نے اسکا بھی خیر مقدم کیا۔ ہومر اور ہیشیوڈ کے عہد میں اس فعل کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ مگر تمدن کی ترقی نے جب آرٹ اور ذوقِ جمال (Aesthetic taste) کے مہذب ناموں سے عریانی اور لذات نفس کی بندگی کو سراہنا شروع کیا تو شہوانی جذبات کا اشتعال بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا کہ فطرت کے راستہ سے تجاوز کرکے یونانیوں کو خلافِ وضع فطرت طریقہ میں تسکین کی جستجو کرنی پڑی۔ آرٹ کے ماہروں نے اس جذبہ کو مجسموں میں نمایاں کیا۔ معلمین اخلاق نے اس کو دو شخصوں کے درمیان "دوستی کا مضبوط رشتہ" قرار دیا۔ سب سے پہلے دو یونانی انسان جو اس قدر کے مستحق سمجھے گئے کہ انکے اہل وطن انکے مجسمے بنا کر انکی یاد تازہ رکھیں وہ ہرموڈیس اور ارشٹوگیٹن تھے جنکے درمیان غیر فطری محبت کا تعلق تھا۔

تاریخ کی شہادت تو یہی ہے کہ اس دور کے بعد یونانی قوم کو زندگی کا کوئی دوسرا دور پھر نصیب نہیں ہوا۔

روم یونانیوں کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا وہ اہلِ روم تھے - یہاں پھر وہی اتار چڑھاؤ کا مرقع ہمارے سامنے آتا ہے جو اوپر آپ دیکھ چکے ہیں - رومی لوگ وحشت کی تاریکی سے نکل کر جب تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو انکے نظام معاشرت کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنے خاندان کا سردار ہے - اسکو اپنی بیوی بچوں پر پورے حقوق مالکانہ حاصل ہیں - بلکہ بعض حالات میں وہ بیوی کو قتل کر دینے کا بھی مجاز ہے -

جب وحشت کم ہوئی اور تمدن و تہذیب میں رومیوں کا قدم آگے بڑھا تو اگرچہ قدیم خاندانی نظام بدستور قائم رہا مگر عملاً اس کی سختیوں میں کچھ کمی واقع ہوئی اور ایک حد تک اعتدالی حالت پیدا ہوتی گئی - رومی جمہوریت کے زمانۂ عروج میں یونان کی طرح پردے کا رواج تو نہ تھا ، مگر عورت اور جوان نسل کو خاندانی نظام کے مضبوط شکنجہ میں کس کر رکھا گیا تھا - عصمت و عفت ، خصوصاً عورت کے معاملہ میں ایک قیمتی چیز تھی اور اسکو معیارِ شرافت سمجھا جاتا تھا - اخلاق کا معیار کافی بلند تھا - ایک مرتبہ رومی سنیٹ کے ایک ممبر نے اپنی بیٹی کے سامنے اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا تو اسکو قومی اخلاق کی سخت توہین سمجھا گیا اور سنیٹ میں اس پر ملامت کا ووٹ پاس کیا گیا - عورت اور مرد کے تعلق کی جائز اور شریفانہ صورت نکاح کے سوا کوئی دوسری نہ تھی - ایک عورت اسی وقت عزت کی مستحق ہوسکتی تھی جبکہ وہ ایک خاندان کی ماں (Matron) ہو - بیسوا طبقہ اگرچہ موجود تھا ، اور مردوں کو ایک حد تک اس طبقہ سے ربط رکھنے کی آزادی تھی ، مگر عام رومیوں کی نگاہ میں اسکی حیثیت نہایت ذلیل تھی ، اور اس سے تعلق رکھنے والے مردوں کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا -

تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اہل روم کا نظریہ عورت کے بارے میں بدلتا چلا گیا ، اور رفتہ رفتہ نکاح و طلاق کے قوانین اور خاندانی نظام کی ترکیب میں اتنا تغیر رونما ہوا کہ صورتِ حال سابق حالات کے بالکل برعکس ہوگئی - نکاح محض ایک قانونی معاہدہ (Civil Contract) بن کر رہ گیا جس

کا قیام و بقاء فریقین کی رضامندی پر منحصر تھا۔ ازدواجی تعلق کی ذمہ داریوں کو بہت ہلکا سمجھا جانے لگا۔ عورت کو وراثت اور ملکیت مال کے پورے حقوق دیدیے گئے اور قانون نے اسکو باپ اور شوہر کے اقتدار سے بالکل آزاد کر دیا۔ رومی عورتیں معاشی حیثیت سے نہ صرف خود مختار ہو گئیں بلکہ قومی دولت کا ایک بڑا حصہ بتدریج ان کے حیطۂ اختیار میں چلا گیا۔ وہ اپنے شوہروں کو بھاری شرح سود پر قرض دیتی تھیں، اور مالدار عورتوں کے شوہر عملاً انکے غلام بن کر رہ جاتے تھے۔ طلاق کی آسانیاں اس قدر بڑھیں کہ بات بات پر ازدواج کا رشتہ توڑا جانے لگا۔ مشہور رومی فلسفی و مدبر سنیکا (۴ ق م۔ ۶۵ء) سختی کے ساتھ رومیوں کی کثرت طلاق پر ماتم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اب روم میں طلاق کوئی بڑی شرم کے قابل چیز نہیں رہی، عورتیں اب اپنی عمر کا حساب اپنے شوہروں کی تعداد سے لگاتی ہیں"۔ اس دور میں ایک ایک عورت یکے بعد دیگرے کئی کئی شادیاں کرتی چلی جاتی تھی۔ مارشل (۴۳ء۔ ۱۰۴ء) ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جو دس خاوند کر چکی تھی۔ جووینل (۶۰ء۔ ۱۴۰ء) ایک عورت کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے پانچ سال میں آٹھ شوہر بدلے۔ سینٹ جروم (۳۴۰ء۔ ۴۲۰ء) ان سب سے زیادہ ایک باکمال عورت کا حال لکھتا ہے جس نے آخری بار تیئیسواں شوہر کیا تھا اور اپنے شوہر کی بھی وہ اکیسویں بیوی تھی۔

اس دور میں عورت اور مرد کے غیر نکاحی تعلق کو معیوب سمجھنے کا خیال بھی دلوں سے نکلتا چلا گیا یہاں تک کہ بڑے بڑے معلمین اخلاق بھی زنا کو ایک معمولی چیز سمجھنے لگے۔ کاٹو (Cato) جس کو ۱۸۴ ق م میں روم کا محتسب اخلاق مقرر کیا گیا تھا صریح طور پر جوانی کی آوارگی کو حق بجانب ٹھیراتا ہے سسرو جیسا شخص جوانوں کے لیے اخلاق کے بندھن ڈھیلے کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اپکٹیٹس (Epictetus) جو فلاسفۂ رواقیین (Stoics) میں بہت ہی سخت اخلاقی اصول رکھنے والا سمجھا جاتا تھا، اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتا ہے کہ "جہاں تک ہو سکے شادی سے پہلے عورت کی صحبت سے اجتناب کرو مگر جو اس معاملہ میں ضبط نہ رکھ سکیں انہیں ملامت بھی نہ کرو۔"

اخلاق اور معاشرت کے بند جب اتنے ڈھیلے ہو گئے تو روم میں شہوانیت، عریانی اور فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ تھیٹروں میں بے حیائی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لیے ضروری ہو گئیں۔ قحبہ گری کے کاروبار کو وہ فروغ نصیب ہوا کہ قیصر ٹائیبیریس (۱۴ء تا ۳۷ء) کے عہد میں معزز خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لیے ایک قانون نافذ کرنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ فلورا (Flora) نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے برسرِ عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی اس دور میں عام تھا۔ رومی لٹریچر میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان کیے جاتے تھے اور عوام و خواص میں وہی ادب مقبول ہوتا تھا جس میں استعارہ و کنایہ تک کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔

بہیمی خواہشات سے اس قدر مغلوب ہو جانے کے بعد روم کا قصرِ عظمت ایسا پیوندِ خاک ہوا کہ پھر اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔

مسیحی یورپ مغربی دنیا کے اس اخلاقی انحطاط کا علاج کرنے کے لیے مسیحیت پہنچی اور اول اول اس نے بڑی اچھی خدمات انجام دیں۔ فواحش کا انسداد کیا۔ عریانی کو زندگی کے ہر شعبہ سے نکالا۔ قحبہ گری کو بند کرنے کی تدبیریں کیں۔ طوائف اور مغنیہ اور رقاصہ عورتوں کو ان کے پیشہ سے توبہ کرائی۔ اور پاکیزہ اخلاقی تصورات لوگوں میں پیدا کیے۔ مگر عورت اور صنفی تعلقات کے بارے میں آبائے مسیحیین جو نظریات رکھتے تھے وہ انتہا پسندی کی بھی انتہا تھے، اور ساتھ ہی فطرتِ انسانی کے خلاف اعلانِ جنگ بھی۔

ان کا ابتدائی اور بنیادی نظریہ یہ تھا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے۔ مرد کے لیے معصیت کی تحریک کا سرچشمہ اور جہنم کا دروازہ ہے۔ تمام انسانی مصائب کا آغاز اسی سے ہوا ہے۔ اس کا عورت ہونا ہی اس کے شرمناک ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس کو اپنے حسن و جمال پر شرمانا چاہیے کیونکہ وہ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کو دائماً کفارہ ادا کرتے رہنا چاہیے کیونکہ وہ دنیا اور دنیا والوں پر

لعنت اور مصیبت لائی ہے۔ ترتولیان (Tertullian) جو ابتدائی دور کے ائمۂ مسیحیت میں سے تھا عورت کے متعلق مسیحی تصور کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:

"وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔ وہ شجرِ ممنوع کی طرف لیجانے والی، خدائی قانون کو توڑنے والی اور خدا کی تصویر — مرد کو غارت کرنے والی ہے"

کرائی سوسٹم (Chrysostom) جو مسیحیت کے اولیائے کبار میں شمار کیا جاتا ہے، عورت کے حق میں کہتا ہے:

"ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارتگر دلربائی اور ایک آراستہ مصیبت"

ان کا دوسرا نظریہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کا صنفی تعلق بجائے خود ایک نجاست اور قابل احتراز چیز ہے، خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اخلاق کا یہ راہبانہ تصور پہلے سے اشراقی فلسفہ (Neo-Platonism) کے زیر اثر مغرب میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ مسیحیت نے آکر اسے حد کو پہنچا دیا۔ اب تجرد اور دوشیزگی معیارِ اخلاق قرار پائی اور تأہّل کی زندگی اخلاقی اعتبار سے پست اور ذلیل سمجھی جانے لگی۔ لوگ ازدواج سے پرہیز کرنے کو تقویٰ اور تقدس اور بلندیٔ اخلاق کی علامت سمجھنے لگے۔ پاک مذہبی زندگی بسر کرنے کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ یا تو آدمی نکاح ہی نہ کرے، یا اگر نکاح کر لیا ہو تو میاں اور بیوی ایک دوسرے سے زن و شو کا تعلق نہ رکھیں۔ متعدد مذہبی مجلسوں میں یہ قوانین مقرر کیے گئے کہ چرچ کے عہدہ دار تخلیہ میں اپنی بیویوں سے نہ ملیں، میاں اور بیوی کی ملاقات ہمیشہ کھلی جگہ میں ہو اور کم از کم دو غیر آدمی وہاں موجود ہوں۔ ازدواجی تعلق کے نجس ہونے کا تخیل طرح طرح سے مسیحیوں کے دل میں بٹھایا جاتا تھا۔ مثلاً ایک قاعدہ یہ تھا کہ جس روز چرچ کا کوئی تہوار ہو اس سے پہلے کی رات جن میاں بیوی نے یکجا گذاری ہو وہ تہوار میں شریک نہیں ہو سکتے۔ گویا انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب

گیا ہے جس سے آلودہ ہونے کے بعد وہ کسی مقدس مذہبی کام میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہتے! اس راہبانہ تصور نے تمام خاندانی علائق، حتی کہ ماں اور بیٹے تک کے تعلق میں بھی تلخی پیدا کردی، اور ہر وہ رشتہ گندگی اور گناہ بن کر رہ گیا جو نکاح کا نتیجہ ہو۔

ان دونوں نظریات نے نہ صرف اخلاق اور معاشرت میں عورت کی حیثیت حد سے زیادہ گرادی بلکہ تمدنی قوانین کو بھی اس درجہ متأثر کیا کہ ایک طرف ازدواجی زندگی مردوں اور عورتوں کے لیے مصیبت بن کر رہ گئی اور دوسری طرف سوسائٹی میں عورت کا مرتبہ ہر حیثیت سے پست ہو گیا۔ مسیحی شریعت کے زیر اثر جتنے قوانین مغربی دنیا میں جاری ہوئے ان سب کی مشترک خصوصیات یہ تھیں:

(۱) معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے بس کر کے مرد کے قابو میں دیدیا گیا۔ وراثت میں اس کے حقوق نہایت محدود تھے اور ملکیت میں اس سے بھی زیادہ۔ وہ خود اپنی محنت کی کمائی پر بھی اختیار نہ رکھتی تھی بلکہ اسکی ہر چیز کا مالک اس کا شوہر تھا۔

(۲) طلاق اور خلع کی سرے سے اجازت ہی نہ تھی۔ زوجین میں خواہ کتنی ہی ناموافقت ہو، باہمی تعلقات کی خرابی سے خواہ گھر نمونۂ جہنم ہی بن گیا ہو، مذہب اور قانون دونوں انکو زبردستی ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ بعض انتہائی شدید حالات میں زیادہ سے زیادہ جو تدارک ممکن تھا وہ صرف یہ تھا کہ زوجین میں تفریق (Separation) کرادی جائے، یعنی وہ ایک دوسرے سے بس الگ کر دیے جائیں۔ الگ ہو کر نکاح ثانی کرنے کا حق نہ عورت کو تھا نہ مرد کو۔ درحقیقت یہ تدارک پہلی صورت سے بھی بدتر تھا کیونکہ اس کے بعد ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو وہ دونوں راہب اور راہبہ بن جائیں، یا پھر تمام عمر بدکاری کرتے رہیں۔

(۳) شوہر کے مرنے کی صورت میں بیوی کے لیے اور بیوی کے مرنے کی صورت میں شوہر کے لیے نکاح ثانی کرنا سخت معیوب بلکہ گناہ قرار دیا گیا تھا۔ مسیحی علما کہتے تھے کہ یہ محض حیوانی خواہشات کی بندگی

اور ہوس رانی ہے - انکی زبان میں اس فعل کا نام "مہذب زنا کاری" تھا - چرچ کے قانون میں مذہبی عہدہ داروں کے لیے نکاح ثانی کرنا جرم تھا - عام ملکی قوانین میں بعض جگہ اسکی سرے سے اجازت ہی نہ تھی، اور جہاں قانون اجازت دیتا تھا وہاں بھی رائے عام، جو مذہبی تصورات کے زیر اثر تھی، اس کو جائز نہ رکھتی تھی -

جدید یورپ | اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ کے فلاسفہ اور اہل قلم نے جب سوسائیٹی کے خلاف فرد کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھائی اور شخصی آزادی کا صور پھونکا تو ان کے سامنے وہی غلط نظام تمدن تھا جو مسیحی نظامِ اخلاق و فلسفۂ زندگی اور نظام جاگیرداری (Feudal System) کے منحوس اتحاد سے پیدا ہوا تھا اور جس نے انسانی روح کو غیر فطری زنجیروں میں جکڑ کر ترقی کے سارے دروازے بند کر رکھے تھے - اس نظام کو توڑ کر ایک نیا نظام بنانے کے لیے جو نظریات جدید یورپ کے معماروں نے پیش کیے اُنکے نتیجہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا اور اسکے بعد مغربی تہذیب و تمدن کی رفتارِ ترقی اُن راستوں پر لگ گئی جن پر بڑھتے بڑھتے وہ آج کی منزل پر پہنچی ہے -

اس جدید دور کے آغاز میں صنف اناث کو پستی سے اٹھانے کے لیے جو کچھ کیا گیا، اجتماعی زندگی پر اس کے خوشگوار نتائج مترتب ہوئے - نکاح و طلاق کے پچھلے قوانین کی سختی کم کی گئی - عورتوں کے معاشی حقوق، جو بالکل سلب کر لیے گئے تھے، بڑی حد تک انہیں واپس دیے گئے - اُن اخلاقی نظریات کی اصلاح کی گئی جنکی بنا پر عورت کو ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا - معاشرت کے اُن اصولوں میں ترمیم کر دی گئی جنکی وجہ سے عورت فی الواقع لونڈی بن کر رہ گئی تھی - اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کے دروازے مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی کھولے گئے - ان مختلف تدبیروں سے رفتہ رفتہ عورتوں کی وہ قابلیتیں جو غلط قوانین معاشرت اور جاہلانہ اخلاقی تصورات کے بھاری بوجھوں تلے دبی ہوئی تھیں ابھر آئیں - انہوں نے گھروں کو سنوارا - معاشرت میں نفاست پیدا کی - رفاہِ عام کے بہت سے مفید کام کیے صحت

عامہ کی ترقی، نئی نسلوں کی عمدہ تربیت، بیماروں کی خدمت، اور فنونِ خانہ داری کا نشوونما، یہ سب کچھ اس بیداری کے ابتدائی پھل تھے جو تہذیبِ نو کی بدولت عورتوں میں رونما ہوئی۔ لیکن جن نظریات کے بطن سے یہ نئی تحریک اٹھی تھی ان میں ابتدا ہی سے افراط کا میلان موجود تھا۔ انیسویں صدی میں اس میلان نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی، اور بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مغربی معاشرت بے اعتدالی کی دوسری انتہا پر پہنچ گئی۔

یہ نظریات جن پر نئی مغربی معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے، تین عنوانات کے تحت آتے ہیں:

(۱) عورتوں اور مردوں کی مساوات۔

(۲) عورتوں کا معاشی استقلال (Economic independence)

(۳) دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط۔

ان تین بنیادوں پر معاشرت کی تعمیر کرنے کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا بالآخر وہی ظاہر ہوا۔

(۱) مساوات کے معنی یہ سمجھ لیے گئے کہ عورت اور مرد نہ صرف اخلاقی مرتبہ اور انسانی حقوق میں مساوی ہوں، بلکہ تمدنی زندگی میں عورت بھی وہی کام کرے جو مرد کرتے ہیں، اور اخلاقی بندشیں عورت کے لیے بھی اسی طرح ڈھیلی کر دی جائیں جس طرح مرد کے لیے پہلے سے ڈھیلی ہیں۔ مساوات کے اس غلط تخیل نے عورت کو اسکے اُن فطری وظائف سے غافل اور منحرف کر دیا جن کی بجاآوری پر تمدن کے بقاء، بلکہ نوع انسانی کے بقاء کا انحصار ہے۔ معاشی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں نے اسکی شخصیت کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا۔ انتخابات کی جدوجہد، دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت، آزاد تجارتی و صنعتی پیشوں میں مردوں کے ساتھ مقابلہ، کھیلوں اور ورزشوں کی دوڑ دھوپ، سوسائیٹی کے تفریحی مشاغل میں شرکت، کلب اور اسٹیج اور رقص و سرود کی مصروفیتیں، یہ اور ان کے سوا اور بہت سی ناکردنی و ناگفتنی چیزیں اس پر کچھ اس طرح چھا گئیں کہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں، بچوں کی تربیت، خاندان کی خدمت،

گھر کی تنظیم، ساری چیزیں اسکے لائحہ عمل سے خارج ہو کر رہ گئیں، بلکہ ذہنی طور پر وہ اِن مشاغل ـــــ اپنے اصلی فطری مشاغل ـــــ سے متنفر ہو گئی۔ اب مغرب میں خاندان کا نظام، جو تمدن کا سنگِ بنیاد ہے، بری طرح منتشر ہو رہا ہے۔ گھر کی زندگی، جسکے سکون پر انسان کی قوت کارکردگی کے نشو و نما کا انحصار ہے، عملاً ختم ہو رہی ہے۔ نکاح کا رشتہ، جو تمدن کی خدمت میں عورت اور مرد کے تعاون کی صحیح صورت ہے، تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہو گیا ہے۔ نسلوں کی افزائش کو برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اولاد کے ذریعہ سے روکا جا رہا ہے۔ اخلاقی مساوات کے غلط تخیل نے عورتوں اور مردوں کے درمیان بد اخلاقی میں مساوات قائم کر دی ہے۔ وہ بے حیائیاں جو کبھی مردوں کے لیے بھی شرمناک تھیں، اب وہ عورتوں تک کے لیے شرمناک نہیں رہیں۔

(۲) عورت کے معاشی استقلال نے اسکو مرد سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ قدیم اصول کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے، اب اس نئے قاعدہ سے بدل گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کمائیں اور گھر کا انتظام بازار کے سپرد کر دیا جائے۔ اس انقلاب کے بعد دونوں کی زندگی میں، بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ایسا ربط باقی نہیں رہا جو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور کرتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ محض شہوانی خواہشات کو پورا کرنا کوئی ایسا کام نہیں ہے جسکی خاطر مرد اور عورت لامحالہ اپنے آپ کو ایک دائمی تعلق ہی کی گرہ میں باندھنے اور ایک گھر بنا کر مشترک زندگی ہی گذارنے پر مجبور ہوں۔ جو عورت اپنی روٹی آپ کماتی ہے، اپنی تمام ضروریات کی خود کفیل ہے، اپنی زندگی میں دوسرے کی حفاظت اور اعانت کی محتاج نہیں ہے، وہ آخر محض اپنی شہوانی خواہش کی تسکین کے لیے کیوں ایک مرد کی پابند ہو؟ کیوں اپنے اوپر بہت سی اخلاقی اور قانونی بندشیں عائد کرے؟ کیوں ایک خاندان کی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے؟ خصوصاً جبکہ اخلاقی مساوات کے تخیل نے اسکی راہ سے وہ تمام رکاوٹیں بھی دور کر دی ہوں جو اسے آزادانہ شہوت رانی کا طریقہ اختیار کرنے میں پیش آسکتی تھیں، تو وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے آسان اور پرلطف اور خوشگوار راستہ

چھوڑ کر قربانیوں اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدا ہوا پرانا دقیانوسی (old fashioned) راستہ کیوں اختیار کرے؟ گناہ کا خیال مذہب کے ساتھ رخصت ہوا۔ سوسائیٹی کی ملامت کا خوف یوں دور ہو گیا کہ سوسائیٹی اب اسے فاحشہ ہونے پر ملامت نہیں کرتی بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ آخری خطرہ حرامی بچے کی پیدائش کا تھا سو اس سے بچنے کے لیے منع حمل کے ذرائع موجود ہیں۔ ان ذرائع کے باوجود حمل قرار پا جائے تو اسقاط میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو بچے کو خاموشی کے ساتھ قتل کیا جا سکتا ہے اور اگر کم بخت جذبۂ مادری نے (جو بدقسمتی سے ابھی بالکل فنا نہیں ہو سکا ہے!) بچے کو ہلاک کرنے سے روک بھی دیا تو حرامی بچے کی ماں بن جانے میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اب "کنواری ماں" اور "ناجائز مولود" کے حق میں اتنا پروپیگنڈا ہو چکا ہے کہ جو سوسائیٹی انکو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کی جرأت کریگی اسے خود تاریک خیالی کا الزام اپنے سر لینا پڑے گا۔

یہ وہ چیز ہے جس نے مغربی معاشرت کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ آج ہر ملک میں لاکھوں جوان عورتیں تجرد پسند ہیں جنکی زندگیاں آزاد شہوت رانی میں بسر ہو رہی ہیں۔ ان سے بہت زیادہ عورتیں ایسی ہیں جو عارضی جذبات محبت کے زور سے شادیاں کر لیتی ہیں، مگر چونکہ اب شہوانی تعلق کے سوا مرد اور عورت کے درمیان کوئی ایسا احتیاجی ربط باقی نہیں رہا ہے جو انہیں مستقل وابستگی پر مجبور کرتا ہو، اسلیے مناکحت کے رشتہ میں اب کوئی پائیداری نہیں رہی۔ میاں اور بیوی جو ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو چکے ہیں، آپس کے تعلقات میں کسی مراعات باہمی اور کسی مدارات (Compromise) کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نری شہوانی محبت کے جذبات بہت جلدی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک ادنیٰ وجہ اختلاف، بلکہ بسا اوقات صرف سرد مہری ہی انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر نکاحوں کا انجام طلاق یا تفریق پر ہوتا ہے۔ منع حمل، اسقاط، قتل اولاد، شرح پیدائش کی کمی اور ناجائز ولادتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد بڑی حد تک اسی سبب کی رہین منت ہے۔ بدکاری، بے حیائی اور امراض خبیثہ کی ترقی میں بھی اس کیفیت کا

بڑا دخل ہے۔

(۳) مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے عورتوں میں حسن کی نمائش، عریانی اور فواحش کو غیر معمولی ترقی دیدی ہے۔ صنفی میلان (Soxual attraction) جو پہلے ہی فطری طور پر مرد اور عورت کے درمیان موجود ہے اور کافی طاقت ور ہے، دونوں صنفوں کے آزادانہ میل جول کی صورت میں بہت آسانی کے ساتھ غیر معمولی حد تک ترقی کر جاتا ہے۔ پھر اس قسم کی مخلوط سوسائیٹی میں قدرتی طور پر دونوں صنفوں کے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ صنف مقابل کے لیے زیادہ سے زیادہ جاذب نظر Attractive) بنیں، اور جبکہ اخلاقی نظریات کے بدل جانے کی وجہ سے ایسا کرنا معیوب بھی نہ رہا ہو، بلکہ علانیہ شانِ دلربائی پیدا کرنے کو مستحسن سمجھا جانے لگا ہو، تو حُسن و جمال کی نمائش رفتہ رفتہ تمام حدود کو توڑتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ برہنگی کی آخری حد کو پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ یہی کیفیت اس وقت مغربی تہذیب میں پیدا ہو گئی ہے۔ صنف مقابل کے لیے مقناطیس بننے کی خواہش عورت میں اتنی بڑھ گئی ہے اور بڑھتی جا رہی ہے کہ شوخ و تنگ لباسوں، غازوں اور سرخیوں اور بناؤ سنگھار کے نت نئے سامانوں سے بھی اسکی تسکین نہیں ہوتی۔ بے چاری تنگ آکر اپنے کپڑوں سے باہر نکلی پڑتی ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات تار تک لگا نہیں رہنے دیتی۔ ادھر مردوں کی طرف سے ہر وقت ہل من مزید کا تقاضا ہے، کیونکہ جذبات میں جو آگ لگی ہوئی ہے وہ حُسن کی ہر بے حجابی پر بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے اور مزید بے حجابی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان غریبوں کی پیاس بھی بڑھتے بڑھتے ٹونس بن گئی ہے، جیسے کسی کو لُو لگ گئی ہو اور پانی کا ہر گھونٹ پیاس کو بجھانے کے بجائے کچھ اور بھڑکا دیتا ہو۔ حد سے بڑھی ہوئی شہوانی پیاس سے بے تاب ہو کر بے چارے ہر وقت ہر ممکن طریقے سے اسکی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ ننگی تصویریں، یہ صنفی لٹریچر، یہ عشق و محبت کے افسانے، یہ عریاں اور جوڑواں ناچ، یہ جذبات شہوانی سے بھرے ہوئے فلم آخر کیا ہیں؟ سب اسی آگ کو بجھانے ــــ مگر در اصل بھڑکانے ــــ کے سامان ہیں جو اس غلط معاشرت نے

ہر سینے میں لگا رکھی ہے۔ اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے اس کا نام انہوں نے رکھا ہے "آرٹ"!
یہ گھن بڑی تیزی کے ساتھ مغربی قوموں کی قوتِ حیات کو کھا رہا ہے۔ یہ گھن لگنے کے بعد آج تک کوئی قوم نہیں بچی۔ یہ اُن تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو کھا جاتا ہے جو قدرت نے انسان کو زندگی اور ترقی کے لیے عطا کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ہر طرف سے شہوانی محرکات میں گھرے ہوئے ہوں، جنکے جذبات کو ہر آن ایک نئی تحریک اور ایک نئے اشتعال سے سابقہ پڑے، جن پر ایک سخت ہیجان انگیز ماحول پوری طرح چھا گیا ہو، جنکے خون کو عریاں تصویریں، فحش لٹریچر، ولولہ انگیز گانے، برانگیختہ کرنے والے ناچ، عشق و محبت کے فلم، دل چھیننے والے زندہ مناظر، اور صنفِ مقابل سے ہر وقت کی مڈبھیڑ کے مواقع پیہم ایک جوش کی حالت میں رکھتے ہوں، وہ کہاں سے وہ امن، وہ سکون اور وہ اطمینان لا سکتے ہیں جو تعمیری اور تخلیقی کاموں کے لیے ضروری ہے یہی نہیں بلکہ ایسے ہیجانات کے درمیان اُن کو، اور خصوصاً اُنکی جوان نسلوں کو وہ ٹھنڈی اور پُرسکون فضا میسر ہی کہاں آسکتی ہے جو انکی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کے نشوونما کے لیے ناگزیر ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی تو بہیمی خواہشات کا دیو اُنکو دبوچ لیتا ہے۔ اس کے چنگل میں پھنس کر وہ پنپ کیسے سکتے ہیں۔

فکرِ انسانی کی المناک نارسائی تین ہزار سال کے تاریخی نشیب و فراز کی یہ مسلسل داستان ایک بڑے خطۂ زمین سے تعلق رکھتی ہے جو پہلے بھی دو عظیم الشان تہذیبوں کا گہوارہ رہ چکا ہے، اور اب پھر جس کی تہذیب کا ڈنکا دنیا میں بج رہا ہے۔ ایسی ہی داستان مصر، بابل، ایران اور دوسرے ممالک کی بھی ہے۔ اور خود ہمارا ملک، ہندوستان بھی صدیوں سے اسی افراط و تفریط میں گرفتار ہے۔ ایک طرف عورت داسی بنائی جاتی ہے، مرد اس کا سوامی اور پتی دیو، یعنی مالک اور معبود بنتا ہے، اس کو بچپن میں باپ کی، جوانی میں شوہر کی اور بیوگی میں اولاد کی مملوکہ بن کر رہنا پڑتا ہے، اسے شوہر کی چتا پر بھینٹ چڑھایا جاتا ہے، اسکو ملکیت اور وراثت کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، اس پر نکاح کے انتہائی سخت قوانین مسلط کیے جاتے ہیں جنکے مطابق وہ اپنی رضا اور پسند کے بغیر ایک مرد کے حوالہ کی جاتی ہے اور پھر زندگی کے آخری سانس تک اُسکی ملکیت سے کسی حال میں نہیں نکل سکتی، اس کو

یہودیوں اور یونانیوں کی طرح گناہ اور اخلاقی و روحانی پستی کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے، اور اسکی مستقل شخصیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جب اس پر مہر کی نگاہ ہوتی ہے تو اسے بھی خواہشات کا کھلونا بنا لیا جاتا ہے۔ وہ مرد کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے اور ایسی سوار ہوتی ہے کہ خود بھی ڈوبتی ہے اور اپنے ساتھ ساری قوم کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ لنگ اور یونی کی پوجا، یہ عبادت گاہوں میں برہنہ اور جوڑواں مجسمے، یہ دیوداسیاں (Religious prostitutes)، یہ ہولی کے کھیل، اور یہ دریاؤں کے نیم عریاں اشنان آخر کس چیز کی یادگار ہیں؟ اُس بام مارگی تحریک کے باقیات غیر صالحات ہی تو ہیں جو ایران، بابل، یونان اور روم کی طرح ہندوستان میں بھی تہذیب و تمدن کی انتہائی ترقی کے بعد وبا کی طرح پھیلی اور ہندو قوم کو صدیوں کے لیے تنزل و انحطاط کے گڑھے میں پھینک گئی۔

اس داستان کو غائر نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے معاملہ میں نقطۂ عدل کو پانا، اور اسے سمجھنا اور اس پر قائم ہونا انسان کے لیے کس قدر دشوار ثابت ہوا ہے۔ نقطۂ عدل یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف عورت کو اپنی شخصیت اور اپنی قابلیتوں کے نشو و نما کا پورا موقع ملے، اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صلاحیتوں کے ساتھ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ مگر دوسری طرف اسکو اخلاقی تنزل و انحطاط کا ذریعہ اور انسانی جماعت کی تباہی کا آلہ نہ بننے دیا جائے، بلکہ مرد کے ساتھ اسکے تعاون کی ایسی سبیل مقرر کر دی جائے کہ دونوں کا اشتراکِ عمل ہر حیثیت سے تمدن کے لیے صحت بخش ہو۔ اس نقطۂ عدل کو دنیا صدہا برس سے تلاش کرتی رہی ہے مگر آج تک نہیں پا سکی۔ کبھی ایک انتہا کی طرف جاتی ہی اور انسانیت کے پورے نصف حصہ کو بیکار بنا کر رکھ دیتی ہے۔ کبھی دوسری انتہا کی طرف جاتی ہے اور انسانیت کے دونوں حصوں کو ملا کر غرقِ مئے ناب کر دیتی ہے۔

نقطۂ عدل ناپید نہیں۔ موجود ہے۔ مگر ہزاروں سال افراط اور تفریط کے درمیان گردش کرتے رہنے کی وجہ سے لوگوں کا سر کچھ اتنا چکرا گیا ہے کہ وہ سامنے آتا ہے اور یہ پہچان نہیں سکتے کہ یہی تو وہ مطلوب ہے

جسے ہماری فطرت ڈھونڈ رہی تھی۔ اس مطلوبِ حقیقی کو دیکھ کر وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، اُس پر آوازے کستے ہیں، اور جسکے پاس وہ نظر آتا ہے اُلٹا اُسی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انکی مثال اس بچے کی سی ہے جو ایک کوئلے کی کان میں پیدا ہوا ہو اور وہیں جوانی کی عمر تک پہنچے۔ ظاہر ہے کہ اسکو وہی کوئلے کی ماری ہوئی آب و ہوا اور وہی کالی کالی فضا ہی عین فطری چیز معلوم ہوگی۔ اور جب وہ اس کان سے نکال کر باہر لایا جائیگا تو عالم فطرت کی پاکیزہ فضا میں ہر شے کو دیکھ کر اول اول وہ ضرور گھبرائے گا۔ مگر انسان آخر انسان ہے۔ اسکی آنکھیں کوئلے کی چھت اور تاروں بھرے آسمان کا فرق محسوس کرنے سے کب تک انکار کرسکتی ہیں؟ اسکے پھیپھڑے گندی ہوا اور صاف ہوا میں آخر کب تک تمیز نہ کرینگے؟

دورِ جدید کا مسلمان

افراط و تفریط کی بھول بھلیاں میں بھٹکنے والی دنیا کو اگر عدل کا راستہ دکھانے والا کوئی ہو سکتا تھا تو وہ صرف مسلمان تھا جس کے پاس اجتماعی زندگی کی ساری گتھیوں کے صحیح حل موجود ہیں۔ مگر دنیا کی بدنصیبی کا یہ بھی ایک عجیب و دردناک پہلو ہے کہ اس اندھیرے میں جس کے پاس چراغ تھا وہی کم بخت رتوندے کے مرض میں مبتلا ہو گیا دوسروں کو راستہ دکھانا تو درکنار خود اندھوں کی طرح بھٹک رہا ہے اور ایک ایک بھٹکنے والے کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔

"پردے" کا لفظ جن احکام کے مجموعہ پر بطورِ عنوان استعمال کیا جاتا ہے، وہ دراصل اسلامی ضابطۂ معاشرت کے نہایت اہم اجزاء پر مشتمل ہیں۔ اس پورے ضابطہ کے سانچہ میں ان احکام کو ان کے صحیح مقام پر رکھ کر دیکھا جائے تو کوئی ایسا شخص جس میں بقدر رمق بھی فطری بصیرت باقی ہو، یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہیگا کہ معاشرت میں اس کے سوا اعتدال و توسط کی کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اس ضابطہ کو اس کی اصلی روح کے ساتھ عملی زندگی میں برت کر دکھا دیا جائے تو اس پر اعتراض کرنا درکنار، مصائب کی ماری ہوئی دنیا سلامتی کے اس سرچشمہ کی طرف خود دوڑتی چلی آئیگی اور اس سے اپنے امراض معاشرت کی دوا حاصل کریگی۔ مگر یہ کام کرے کون؟ جو اسے کر سکتا تھا وہ خود ایک مدت سے بیمار ہے اور ان سے بھی زیادہ بیمار ہے جن کے درد کی دوا اس کے پاس ردّی کے انبار میں دبی پڑی ہے۔ آئیے، آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ایک نظر اس کے مرض کا بھی جائزہ لے لیں۔

تاریخی پس منظر اٹھارہویں صدی کا آخری اور انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا جب مغربی قوموں کی ملک گیری

کا سیلاب ایک طوفان کی طرح اسلامی ممالک پر امنڈ آیا، اور مسلمان ابھی نیم خفتہ و نیم بیدار ہی تھے کہ دیکھتے دیکھتے یہ طوفان مشرق سے لے کر مغرب تک تمام دنیائے اسلام پر چھا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک پہنچتے پہنچتے بیشتر مسلمان قومیں یورپ کی غلام ہو چکی تھیں اور جو غلام نہ ہوئی تھیں وہ بھی مغلوب و مرعوب ضرور ہو گئی تھیں۔ جب اس انقلاب کی تکمیل ہو چکی تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔ وہ قومی غرور جو صدہا برس تک جہانبانی و کشورکشائی کے میدان میں سربلند رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا، دفعۃً خاک میں مل گیا۔ اور اُس شرابی کی طرح جس کا نشہ کسی طاقتور دشمن کی پیہم ضربات نے اتار دیا ہو، انہوں نے اپنی شکست اور فرنگیوں کی فتح کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا۔ لیکن ابھی دماغ درست نہیں ہوا تھا۔ گو نشہ اتر گیا تھا، مگر عقل کا توازن ابھی تک بگڑا ہوا تھا۔ ایک طرف ذلت کا شدید احساس تھا جو اس حالت کو بدل دینے پر اصرار کر رہا تھا۔ دوسری طرف صدیوں کی آرام طلبی اور سہولت پسندی تھی جو تبدیل حالت کا سب سے آسان اور سب سے زیادہ قریب کا راستہ ڈھونڈھنا چاہتی تھی۔ تیسری طرف سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی زنگ خوردہ قوتیں تھیں جن سے کام لینے کی عادت سالہا سال سے چھوٹی ہوئی تھی۔ ان سب پر مزید وہ مرعوبیت اور دہشت زدگی تھی جو ہر شکست خوردہ غلام قوم میں فطرۃً پیدا ہو جاتی ہے۔ ان مختلف اسباب نے مل جل کر اصلاح پسند مسلمانوں کو بہت سی عقلی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا کر دیا۔ ان میں سے اکثر تو اپنی پستی اور یورپ کی ترقی کے حقیقی اسباب سمجھ ہی نہ سکے۔ اور جنہوں نے انکو سمجھا، ان میں بھی اتنی ہمت، جفاکشی، اور مجاہدانہ اسپرٹ نہ تھی کہ ترقی کے دشوار گذار راستوں کو اختیار کرتے۔ مرعوبیت اس پر مستزاد تھی جس میں دونوں گروہ برابر کے شریک تھے۔ اس بگڑی ہوئی ذہنیت کے ساتھ ترقی کا سہل ترین راستہ جو ان کو نظر آیا وہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن کے مظاہر کا عکس اپنی زندگی میں اتار لیں اور اُس آئینہ کی طرح بن جائیں جسکے اندر باغ و بہار کے مناظر تو سب کے سب موجود ہوں مگر درحقیقت نہ باغ ہو، نہ بہار۔

ذہنی غلامی یہی بحرانی کیفیت کا زمانہ تھا جس میں مغربی لباس، مغربی معاشرت، مغربی آداب و اطوار حتی

کہ چال ڈھال اور بول چال تک میں مغربی طریقوں کی نقل اتاری گئی ۔ اسلامی سوسائٹی کو مغربی سانچوں میں ڈھالنے کی کوششیں کی گئیں ۔ الحاد، دہریت اور مادہ پرستی کو فیشن کے طور پر بغیر سمجھے بوجھے قبول کیا گیا۔ ہر وہ پختہ یا خام تخیل جو مغرب سے آیا، اس پر ایمان بالغیب لانا اور اپنی مجلسوں میں اسکو موضوع بحث بنانا روشن خیالی کا لازمہ سمجھا گیا ۔ شراب، جوا، لاٹری، ریس، تھیٹر، رقص و سرود اور مغربی تہذیب کے دوسرے ثمرات کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ۔ شائستگی، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، حتی کہ مذہبی عقائد اور عبادات کے متعلق بھی جتنے مغربی نظریات یا عملیات تھے ان کو کسی تنقید اور کسی فہم و تدبر کے بغیر اسطرح تسلیم کر لیا گیا کہ گویا وہ آسمان سے اتری ہوئی وحی ہیں جس پر سمعنا و اطعنا کہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ۔ اسلامی تاریخ کے واقعات، اسلامی شریعت کے احکام، اور قرآن و حدیث کے بیانات میں سے جس جس چیز کو اسلام کے پرانے دشمنوں نے نفرت یا اعتراض کی نگاہ سے دیکھا اس پر مسلمانوں کو بھی شرم آنے لگی اور انہوں نے کوشش کی کہ اس داغ کو کسی طرح دھو ڈالیں ۔ انہوں نے جہاد پر اعتراض کیا ۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور بھلا ہم کہاں اور جہاد کہاں ؟ انہوں نے غلامی پر اعتراض کیا ۔ انہوں نے کہا کہ غلامی تو ہمارے ہاں بالکل ہی ناجائز ہے ۔ انہوں نے تعدد ازدواج پر اعتراض کیا ۔ انہوں نے فوراً قرآن کی ایک آیت پر خط نسخ پھیر ڈالا ۔ انہوں نے کہا کہ عورت اور مرد میں کامل مساوات ہونی چاہیے ۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہی ہمارا مذہب بھی ہے ۔ انہوں نے قوانین نکاح و طلاق پر اعتراضات کیے ۔ یہ ان سب میں ترمیم کر دینے پر تل گئے ۔ انہوں نے کہا کہ سود کی حرمت معاشی اصول کے بالکل خلاف ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو صرف سود در سود حرام ہے ۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آرٹ کا دشمن ہے ۔ انہوں نے کہا کہ اسلام تو ہمیشہ سے ناچ گانے اور مصوری و بت تراشی کی سرپرستی کرتا رہا ہے ۔

مسئلہ حجاب کی ابتداء مسلمانوں کی تاریخ میں یہ دور سب سے زیادہ شرمناک ہے، اور یہی دور ہے جس میں پردے کے سوال پر بحث چھڑی ۔ اگر سوال محض اس قدر ہوتا کہ اسلام میں عورت کے لیے آزادی کی کیا حد مقرر کی گئی ہے تو جواب کچھ بھی مشکل نہ ہوتا ۔ زیادہ سے زیادہ جو اختلاف اس باب میں پایا جاتا ہے وہ محض اس حد تک ہے

کہ چہرہ اور ہاتھ کھولنا جائز ہے یا نہیں، اور یہ کوئی اہم اختلاف نہیں ہے۔ لیکن دراصل یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مسلمانوں میں یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوا کہ یورپ نے "حرم" اور پردہ و نقاب کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اپنے لٹریچر میں اسکی نہایت گھناؤنی اور مضحکہ انگیز تصویریں کھینچیں، اسلام کے عیوب کی فہرست میں عورتوں کی "قید" کو نمایاں جگہ دی۔ اب کیونکر ممکن تھا کہ مسلمانوں کو حسب دستور اس چیز پر بھی شرم نہ آنے لگتی۔ انہوں نے جو کچھ جہاد اور غلامی اور تعدد ازدواج اور ایسے ہی دوسرے مسائل میں کیا تھا وہی اس مسئلہ میں بھی کیا۔ قرآن اور حدیث اور اجتہادات ائمہ کی ورق گردانی محض اس غرض سے کی گئی کہ وہاں اس اس "بدنما داغ" کو دھونے کے لیے کچھ سامان ملتا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض ائمہ نے ہاتھ اور منہ کھولنے کی اجازت دی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ عورت میدان جنگ میں سپاہیوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے بھی جا سکتی ہے۔ مسجدوں میں نماز کے لیے جانے اور علم سیکھنے اور درس دینے کی بھی گنجائش پائی گئی۔ بس اتنا مواد کافی تھا۔ دعویٰ کر دیا گیا کہ اسلام نے عورت کو پوری آزادی عطا کی ہے۔ پردہ محض ایک جاہلانہ رسم ہے جس کو تنگ نظر اور تاریک خیال مسلمانوں نے قرون اولیٰ کے بہت بعد اختیار کیا ہے۔ قرآن اور حدیث پردہ کے احکام سے خالی ہیں۔ ان میں تو صرف شرم و حیا کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے، کوئی ایسا ضابطہ نہیں بنایا گیا جو عورت کی نقل و حرکت پر کوئی قید عائد کرتا ہو۔

اصل محرکات انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اپنی زندگی کے معاملات میں جب وہ کوئی مسلک اختیار کرتا ہے تو عموماً اس کے انتخاب کی ابتدا ایک جذباتی غیر عقلی رجحان سے ہوتی ہے، اور اس کے بعد وہ اپنے اس رجحان کو معقول ثابت کرنے کے لیے عقل و استدلال سے مدد لیتا ہے۔ پردے کی بحث میں بھی ایسی ہی صورت پیش آئی۔ اس کی ابتدا کسی عقلی یا شرعی ضرورت کے احساس سے نہیں ہوئی، بلکہ دراصل اُس رجحان سے ہوئی جو ایک غالب قوم کے خوشنما تمدن سے متاثر ہونے، اور اسلامی تمدن کے خلاف اُس

قوم کے پروپیگنڈا سے مرعوب ہو جانے کا نتیجہ تھا۔

ہمارے اصلاح طلب حضرات نے جب دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ فرنگی عورتوں کی زینت و آرائش اور انکی آزادانہ نقل و حرکت، اور فرنگی معاشرت میں انکی سرگرمیوں کو دیکھا تو اضطراری طور پر انکے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ہماری عورتیں بھی اسی روش پر چلیں تاکہ ہمارا تمدن بھی فرنگی تمدن کا ہم سر ہو جائے۔ پھر وہ آزادی نسواں، اور تعلیم اناث، اور مساوات مرد و زن کے اُن جدید نظریات سے بھی متاثر ہوئے جو طاقتور استدلالی زبان اور شاندار طباعت کے ساتھ بارش کی طرح مسلسل اُن پر برس رہے تھے۔ اس لٹریچر کی زبردست طاقت نے انکی قوت تنقید کو ماؤف کر دیا اور انکے وجدان میں یہ بات اتر گئی کہ ان نظریات پر ایمان بالغیب لانا اور تحریر و تقریر میں انکی وکالت کرنا اور (بقید جرأت و ہمت) عملی زندگی میں بھی انکو رائج کر دینا ہر اُس شخص کے لیے ضروری ہے جو "روشن خیال" کہلانا پسند کرتا ہو اور "دقیانوسیت" کے بدترین الزام سے بچنا چاہتا ہو۔ نقاب کے ساتھ سادہ لباس میں چھپی ہوئی عورتوں پر جب کفن پوش جنازے کی پھبتی کسی جاتی تھی تو یہ بیچارے شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتے تھے۔ آخر کہاں تک ضبط کرتے؟ مجبور ہو کر، یا مسحور ہو کر بہر حال اس شرم کے دھبے کو دھونے پر آمادہ ہو ہی گئے۔

انیسویں صدی کے آخری زمانے میں آزادی نسواں کی جو تحریک مسلمانوں میں پیدا ہوئی اسکے اصلی محرک یہی جذبات و رجحانات تھے۔ بعض لوگوں کے شعور خفی میں یہ جذبات چھپے ہوئے تھے اور انکو خود بھی معلوم نہ تھا کہ دراصل کیا چیز انہیں اس تحریک کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ لوگ خود اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا تھے۔ اور بعض کو خود اپنے اِن جذبات کا بخوبی احساس تھا، مگر انھیں اپنے اصلی جذبات کو ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ یہ خود تو دھوکے میں نہ تھے لیکن انہوں نے دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ بہر حال دونوں گروہوں نے کام ایک ہی کیا اور وہ یہ تھا کہ اپنی تحریک کے اصل محرکات کو چھپا کر اسکو ایک جذباتی تحریک کے بجائے ایک عقلی تحریک بنانے کی کوشش کی۔ عورتوں کی صحت، اُنکے عقلی و عملی ارتقار، اُنکے فطری اور پیدائشی

حقوق، اُنکے معاشی استقلال، مردوں کے ظلم و استبداد سے اُنکی رہائی، اور قوم کا نصف حصہ ہونے کی حیثیت سے اُنکی ترقی پر پورے تمدن کی ترقی کا انحصار، اور ایسے ہی دوسرے چلتے جو براہ راست یورپ سے درآمد ہوئے تھے اس تحریک کی تائید میں پیش کیے گئے، تاکہ عام مسلمان دھوکے میں مبتلا ہوجائیں، اور اُن پر یہ حقیقت نہ کھل سکے کہ اس تحریک کا اصل مقصد مسلمان عورت کو اس روش پر چلانا ہے جس پر یورپ کی عورت چل رہی ہے، اور نظام معاشرت میں اُن طریقوں کی پیروی کرنا ہے جو اس وقت فرنگی قوموں میں رائج ہیں۔

سب سے بڑا فریب لیکن سب سے زیادہ شدید اور قبیح فریب جو اس سلسلہ میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث سے استدلال کرکے اس تحریک کو اسلام کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ اسلام اور مغربی تہذیب کے مقاصد اور تنظیم معاشرت کے اصولوں میں زمین و آسمان کا بعد ہے۔ اسلام کا اصل مقصد جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، انسان کی شہوانی قوت (Sex-energy) کو اخلاقی ڈسپلن میں لاکر اس طرح منضبط کرنا ہے کہ وہ آوارگی عمل اور ہیجانِ جذبات میں ضائع ہونے کے بجائے ایک پاکیزہ اور صالح تمدن کی تعمیر میں صرف ہو۔ برعکس اسکے مغربی تمدن کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے معاملات اور ذمہ داریوں میں عورت اور مرد کو یکساں شریک کرکے مادی ترقی کی رفتار تیز کردی جائے اور اسکے ساتھ شہوانی جذبات کو ایسے فنون اور مشاغل میں استعمال کیا جائے جو کشمکش حیات کی تلخیوں کو لطف اور لذت میں تبدیل کردیں۔ مقاصد کے اس اختلاف کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تنظیم معاشرت کے طریقوں میں بھی اسلام اور مغربی تمدن کے درمیان اصولی اختلاف ہو۔ اسلام اپنے مقصد کے لحاظ سے معاشرت کا ایسا نظام وضع کرتا ہے جس میں عورت اور مرد کے دوائرِ عمل بڑی حد تک الگ کردیئے گئے ہیں۔ دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط کو روکا گیا ہے اور ان تمام اسباب کا قلع قمع کیا گیا ہے جو اس نظم و ضبط میں برہمی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی تمدن کے پیش نظر جو مقصد ہے اس کا طبعی اقتضا یہ ہے کہ دونوں صنفوں کو زندگی کے ایک ہی میدان میں کھینچ لایا جائے، اور ان کے درمیان سے وہ تمام حجابات اٹھا دیے جائیں جو اُن کے

آزادانہ اختلاط اور معاملت میں مانع ہوں، اور ان کو ایک دوسرے کے حسن اور صنفی کمالات سے لطف اندوز ہونے کے غیر محدود مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

اب ہر صاحبِ عقل انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ ایک طرف مغربی تمدن کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظمِ معاشرت کے قوانین کو اپنے لیے حجت بناتے ہیں وہ کس قدر سخت فریب میں خود مبتلا ہیں یا دوسروں کو مبتلا کر رہے ہیں۔ اسلامی نظمِ معاشرت میں تو عورت کے لیے آزادی کی آخری حد یہ ہے کہ حسبِ ضرورت ہاتھ اور منہ کھول سکے اور اپنی حاجات کے لیے گھر سے باہر نکل سکے مگر یہ لوگ اس آخری حد کو اپنے سفر کا نقطۂ آغاز بناتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر اسلام رُک جاتا ہے وہاں سے یہ چلنا شروع کرتے ہیں، اور یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ حیا اور شرم بالائے طاق رکھ دی جاتی ہے۔ ہاتھ اور منہ ہی نہیں بلکہ خوبصورت مانگ نکلے ہوئے سر، اور شانوں تک کھلی ہوئی باہیں اور نیم عریاں سینے بھی نگاہوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، اور جسم کے باقی ماندہ محاسن کو بھی ایسے باریک کپڑوں میں ملفوف کیا جاتا ہے کہ ہر وہ چیز ان میں سے نظر آسکے جو مردوں کی شہوانی پیاس کو تسکین دے سکتی ہو۔ پھر ان لباسوں اور آرائشوں کے ساتھ محرموں کے سامنے نہیں بلکہ دوستوں کی محفلوں میں بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو لایا جاتا ہے، اور انکو غیروں کے ساتھ ہنسنے، بولنے اور کھیلنے میں وہ آزادی بخشی جاتی ہے جو مسلمان عورت اپنے سگے بھائی کے ساتھ بھی نہیں برت سکتی۔ گھر سے نکلنے کی جو اجازت محض ضرورت کی قید اور کامل ستر پوشی و حیاداری کی شرط کے ساتھ دی گئی تھی، اس کو جاذبِ نظر ساڑیوں اور نیم عریاں بلاؤزوں اور بے باک نگاہوں کے ساتھ سڑکوں پر پھرنے، پارکوں میں ٹہلنے، ہوٹلوں کے چکر لگانے اور سینماؤں کی سیر کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کو خانہ داری کے ماسوا زندگی کے دوسرے امور میں حصہ لینے کی جو مقید اور مشروط آزادی اسلام میں دی گئی تھی اسکو حجت بنایا جاتا ہے اس غرض کے لیے کہ مسلمان عورتیں بھی فرنگی عورتوں کی طرح گھر کی زندگی اور اسکی ذمہ داریوں کو طلاق دے کر سیاسی و معاشی اور عمرانی سرگرمیوں میں ماری ماری پھریں اور عمل کے ہر میدان میں مردوں کے ساتھ دوڑ دھوپ شروع کر دیں

ہندوستان میں تو معاملہ یہیں تک ہے۔ مصر اور ٹرکی اور ایران میں سیاسی آزادی رکھنے والے ذہنی غلام اس سے بھی دس قدم آگے نکل گئے ہیں۔ وہاں "مسلمان" عورتیں ٹھیک وہی لباس پہننے لگی ہیں جو یورپین عورت پہنتی ہے تاکہ اصل اور نقل میں کوئی فرق ہی نہ رہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر کمال یہ ہے کہ ترکی خواتین کے فوٹو بارہا اس ہیئت میں دیکھے گئے ہیں کہ غسل کا لباس پہنے ساحل سمندر پر نہا رہی ہیں —— وہی لباس جس میں تین چوتھائی جسم برہنہ رہتا ہے اور ایک چوتھائی حصہ اس طرح پوشیدہ ہوتا ہے کہ جسم کے سارے نشیب و فراز سطح لباس پر نمایاں ہو جاتے ہیں!

کیا کسی قرآن اور کسی حدیث سے اس شرمناک طرزِ زندگی کے لیے بھی کوئی جواز کا پہلو نکالا جا سکتا ہے؟ جب تم کو اس راہ پر جانا ہے تو صاف اعلان کرکے جاؤ کہ ہم اسلام سے اور اس کے قانون سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسی ذلیل منافقت اور بددیانتی ہے کہ جس نظام معاشرت اور طرزِ زندگی کے اصول، مقاصد اور عملی اجزاء میں سے ایک ایک چیز کو قرآن حرام کہتا ہے اسے علی الاعلان اختیار کرتے ہو، مگر اس راستہ پر پہلا قدم قرآن ہی کا نام لے کر رکھتے ہو تاکہ دنیا اس فریب میں مبتلا رہے کہ باقی قدم بھی قرآن ہی کے مطابق ہوں گے۔

ہمارا اپیش نظر کام یہ دورِ جدید کے "مسلمان" کا حال ہے۔ اب ہمارے سامنے بحث کے دو پہلو ہیں، اور اس کتاب میں انہی دونوں پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھا جائیگا۔

اولاً ہم کو تمام انسانوں کے سامنے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسلام کے نظام معاشرت کی تشریح کرنی ہے اور یہ بتانا ہے کہ اس نظام میں پردے کے احکام کس لیے دیے گئے ہیں۔

ثانیاً ہمیں ان دورِ جدید کے "مسلمانوں" کے سامنے قرآن و حدیث کے احکام اور مغربی تمدن و معاشرت کے نظریات و نتائج، دونوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل رکھ دینا ہے تاکہ یہ منافقانہ روش، جو انہوں نے اختیار کر رکھی ہے ختم ہو اور یہ شریف انسانوں کی طرح دو صورتوں میں سے کوئی

ایک صورت اختیار کریں : یا تو اسلامی احکام کی پیروی کریں اگر مسلمان رہنا چاہتے ہیں، یا اسلام سے قطع تعلق کریں اگر اُن شرمناک نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جن کی طرف مغربی نظام معاشرت لامحالہ ان کو لے جانے والا ہے۔

نظریات

پردے کی مخالفت جن وجوہ سے کی جاتی ہے وہ محض سلبی نوعیت ہی کے نہیں ہیں بلکہ دراصل ایک ثبوتی و ایجابی بنیاد پر قائم ہیں۔ انکی بنا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگ عورتوں کے گھر میں رہنے اور نقاب کے ساتھ باہر نکلنے کو ناروا قید سمجھتے ہیں اور بس اسے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر عورت کے لیے زندگی کا ایک دوسرا نقشہ ہے، تعلقات مرد و زن کے بارے میں وہ اپنا ایک مستقل نظریہ رکھتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں یہ نہ کریں بلکہ کچھ اور کریں، اور پردے پر ان کا اعتراض اس وجہ سے ہے کہ عورت اپنی اس خانہ نشینی اور روپوشی کے ساتھ نہ تو زندگی کا وہ نقشہ جما سکتی ہے، نہ وہ "کچھ اور" کر سکتی ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ "کچھ اور" کیا ہے، اسکی تہ میں کونسے نظریات اور کونسے اصول ہیں، وہ بجائے خود کہاں تک درست اور معقول ہے، اور عملاً اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر اُنکے نظریات اور اصولوں کو جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے تب تو پردہ، اور وہ نظام معاشرت جس کا جُزء یہ پردہ ہے، واقعی سراسر غلط قرار پائیگا۔ مگر ہم بغیر کسی تنقید اور بغیر کسی عقلی اور تجربی امتحان کے آخر کیوں اُنکے نظریات تسلیم کر لیں؟ کیا محض جدید ہونا، یا محض یہ واقعہ کہ ایک چیز دنیا میں زور شور سے چل رہی ہے، اس بات کے لیے بالکل کافی ہے کہ آدمی کسی جانچ پڑتال کے بغیر اسکے آگے سپر ڈال ہی دے؟

اٹھارویں صدی کا تصور آزادی جیسا کہ میں اس سے پہلے اشارہ کر چکا ہوں، اٹھارویں صدی میں جن فلاسفہ اور علمائے طبیعین اور اہل ادب نے اصلاح کی آواز بلند کی تھی انکو دراصل ایک ایسے نظام تمدن سے

سابقہ درپیش تھا جسمیں طرح طرح کی جکڑبندیاں تھیں، جو کسی پہلو سے لوچ اور لچک نام کو نہ رکھتا تھا، جو غیر معقول رواجوں، جامد قاعدوں، اور عقل و فطرت کے خلاف صریح تناقضات سے لبریز تھا۔ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اسکو ترقی کے ہر راستہ میں سنگِ گراں بنادیا تھا۔ ایک طرف نئی عقلی و عملی بیداری طبقۂ متوسط میں اُبھرنے اور ذاتی جدوجہد سے آگے بڑھنے کا پرجوش جذبہ پیدا کر رہی تھی۔ اور دوسری طرف امرا اور پیشوایانِ مذہب کا طبقہ اُنکے اوپر بیٹھا ہوا روایتی قیود کی گرہیں مضبوط کرنے میں لگا ہوا تھا۔ چرچ سے لیکر فوج اور عدالت کے محکموں تک، قصور امارت سے لیکر کھیتوں اور مالی لین دین کی کوٹھیوں تک زندگی کا ہر شعبہ اور اجتماعی تنظیمات کا ہر ادارہ اس طرح کام کر رہا تھا کہ محض پہلے سے قائم شدہ حقوق کے زور پر چند مخصوص طبقے ان نئے اُبھرنے والے لوگوں کی محنتوں اور قابلیتوں کے ثمرات چھین لے جاتے تھے جو ان طبقوں سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ہر وہ کوشش جو اس صورت حال کی اصلاح کے لیے کی جاتی تھی، برسر اقتدار طبقوں کی خود غرضی و جہالت کے مقابلہ میں ناکام ہو جاتی تھی۔ ان وجوہ سے اصلاح پسند لوگوں میں روز بروز اندھا انقلابی جوش پیدا ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ بالآخر اس پورے اجتماعی نظام اور اس کے ہر شعبے اور ہر جزء کے خلاف بغاوت کا جذبہ پھیل گیا اور شخصی آزادی کا ایک ایسا انتہا پسندانہ نظریہ مقبول عام ہوا جس کا مقصد سوسائٹی کے مقابلہ میں فرد کو حریت تامہ اور اباحت مطلقہ عطا کردینا تھا۔ کہا جانے لگا کہ فرد کو پوری خود مختاری کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق ہر وہ کام کرنے کا حق ہونا چاہیے جو اسکو پسند آئے، اور ہر اس کام سے باز رہنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے جو اسے پسند نہ آئے۔ سوسائٹی کو اسکی انفرادی آزادی چھین لینے کا کوئی حق نہیں۔ حکومت کا فرض صرف یہ ہے کہ افراد کی اس آزادیٔ عمل کو محفوظ رکھے۔ اور اجتماعی ادارات صرف اسلیے ہونے چاہییں کہ فرد کو اسکے مقاصد حاصل کرنے میں مدد دیں۔

آزادی کا یہ مبالغہ آمیز تصور، جو دراصل ایک ظالمانہ اجتماعی نظام کے خلاف غصہ کا نتیجہ تھا، اپنے اندر ایک بڑے اور عظیم تر فساد کے جراثیم رکھتا تھا۔ جن لوگوں نے اس کو ابتداءً پیش کیا، وہ خود بھی پوری طرح اسکے

منطقی نتائج سے آگاہ نہ تھے - شاید اُنکی روح کانپ اٹھتی اگر ان کے سامنے وہ نتائج متمثل ہو کر آجاتے جن پر ایسی بے قید اباحت اور ایسی خود سرانہ انفرادیت لازماً منتہی ہونے والی تھی - انہوں نے زیادہ تر اُن ناروا سختیوں اور غیر معقول بندشوں کو توڑنے کے لیے اسے بطور ایک آلہ کے استعمال کرنا چاہا تھا جو اُن کے زمانہ کی سوسائیٹی میں پائی جاتی تھیں - لیکن بالآخر اس تصور نے مغربی ذہن میں جڑ پکڑ لی اور نشو و نما پانا شروع کر دیا -

انیسویں صدی کے تغیرات فرانس کا انقلاب اِسی تصور آزادی کے زیر اثر رونما ہوا[1] - اس انقلاب میں بہت سے پرانے اخلاقی نظریات اور تمدنی و مذہبی ضابطوں کی دھجیاں اڑا دی گئیں - اور جب ان کا اڑانا ترقی کا ذریعہ ثابت ہوا تو انقلاب پسند دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر وہ نظریہ اور ہر وہ ضابطۂ عمل جو پہلے سے چلا آرہا ہے، ترقی کی راہ کا روڑا ہے، اُسے ہٹائے بغیر قدم آگے نہیں بڑھ سکتا - چنانچہ مسیحی اخلاقیات کے غلط اصولوں کو توڑنے کے بعد بہت جلدی انکی معترض تنقید انسانی اخلاقیات کے اساسی تصورات کی طرف متوجہ ہو گئی - یہ عصمت کیا بلا ہے؟ یہ جوانی پر تقویٰ کی مصیبت آخر کیوں ڈالی گئی ہے؟ نکاح کے بغیر اگر کوئی کسی سے محبت کرے تو کیا بگڑ جاتا ہے؟ اور نکاح کے بعد کیا دل آدمی کے سینے سے نکل جاتا ہے کہ اس سے محبت کرنے کا حق چھین لیا جائے؟ اس قسم کے سوالات نئی انقلابی سوسائیٹی میں ہر طرف سے اٹھنے لگے اور خصوصیت کے ساتھ افسانوی گروہ (Romantic School) نے ان کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ اٹھایا - انیسویں صدی کے آغاز میں ژورژ ساں (George Sand) اس گروہ کی لیڈر تھی - اس عورت نے خود اُن تمام اخلاقی اصولوں کو توڑا تھا جن پر ہمیشہ سے انسانی شرافت اور خصوصاً عورت کی عزت کا مدار رہا ہے - اس نے ایک شوہر کی بیوی ہوتے ہوئے حصن نکاح سے باہر آزادانہ تعلقات قائم کیے - آخر کار شوہر سے مفارقت ہوئی - اسکے بعد یہ دوست پر دوست بدلتی چلی گئی اور کسی کے ساتھ برس دو برس سے زیادہ نباہ نہ کیا - اسکی سوانح حیات میں کم از کم چھ ایسے آدمیوں کے نام ملتے ہیں جنکی

[1] انفرادی آزادی کے اس تخیل سے موجودہ نظام سرمایہ داری (۴۴) جمہوری نظام تمدن، اور اخلاقی آوارگی licentiousness
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵ پر)

ساتھ اُسکی علانیہ اور باقاعدہ آشنائی رہی ہے - اسکے انہی دوستوں میں سے ایک اسکی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے: ”ژورژ ساں پہلے ایک پروانے کو پکڑتی ہے اور اسے پھولوں کے پنجرے میں قید کرتی ہے —— یہ اُسکی محبت کا دور ہوتا ہے - پھر وہ اپنے پن سے اسکو چھونا شروع کرتی ہے اور اسکے پھڑپھڑانے سے لطف اٹھاتی ہے —— یہ اُسکی سرد مہری کا دور ہوتا ہے اور دیر یا سویر یہ دور بھی ضرور آتا ہے —— پھر وہ اسکے پر نوچ کر اور اسکا تجزیہ کرکے اسے ان پروانوں کے ذخیرے میں شامل کرلیتی ہے جن سے وہ اپنے ناولوں کے لیے ہیرو کا کام لیا کرتی ہے۔“ فرانسیسی شاعر الفرے مُسے (Alfred Musse) بھی اسکے عُشاق میں سے تھا، اور آخر کار وہ اُسکی بیوفائیوں سے اس قدر دل شکستہ ہوا کہ مرتے وقت اس نے وصیت کی کہ ژورژ ساں اسکے جنازے پر نہ آنے پائے - یہ تھا اس عورت کا ذاتی کیرکٹر جو کم و بیش تیس سال تک اپنی شاداب تحریروں سے فرانس کی نوخیز نسلوں پر گہرا اثر ڈالتی رہی - اپنے ناول لیلیا (Lelia) میں وہ لیلیا کی طرف سے استینیو کو لکھتی ہے:

”جس قدر زیادہ مجھے دنیا کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے میں محسوس کرتی جاتی ہوں کہ محبت کے متعلق ہمارے نوجوانوں کے خیالات کتنے غلط ہیں - یہ خیال غلط ہے کہ محبت ایک ہی سے ہونی چاہیے اور اسکا دل پر پورا قبضہ ہونا چاہیے اور وہ ہمیشہ کے لیے ہونی چاہیے - بلاشبہ تمام مختلف خیالات کو گوارا کرنا چاہیے - میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ بعض خاص روحوں کو ازدواجی زندگی میں وفادار رہنے کا حق ہے - مگر اکثریت کچھ دوسری ضروریات اور کچھ دوسری قابلیتیں رکھتی ہے - اس کے لیے ضرورت ہے کہ طرفین ایک دوسرے کو آزادی دیں، باہمی رواداری سے کام لیں، اور اس خود غرضی کو دل سے نکال دیں جسکی وجہ سے رشک و رقابت کے جذبات

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴ - کی تخلیق ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ صدی کے اندر اس نے یورپ اور امریکہ میں اتنے ظلم ڈھائے کہ انسانیت اسکے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو گئی، کیونکہ اس نظام نے فرد کو جماعتی مفاد کے خلاف خود غرضانہ عمل کرنے کا لائسنس دیکر اجتماعی فلاح و بہبود کو ذبح کر ڈالا اور جماعتی زندگی کو پارہ پارہ کر دیا - سوشلزم اور فاشزم دونوں اسی بغاوت کے مظاہر ہیں، لیکن اس نئی تعمیر میں ابتدا ہی سے ایک خرابی کی صورت مضمر ہے - یہ در اصل ایک انتہا کا علاج دوسری انتہا سے ہے - اٹھارویں صدی کے تصورِ حریتِ شخصی کا قصور یہ تھا کہ وہ جماعت کو فرد پر قربان کرتا تھا - اور اس بیسویں صدی کے تصورِ اجتماع کا قصور یہ ہے کہ یہ فرد کو جماعت پر قربان کرنا چاہتا ہے - فلاح انسانیت کے لیے ایک متوازن نظریہ آج بھی ویسا ہی نایاب ہے جیسا اٹھارویں صدی میں تھا -

پیدا ہوتے ہیں۔ ...... تمام محبتیں صحیح ہیں، خواہ وہ تیز و تند ہوں یا پر سکون، شہوانی ہوں یا روحانی، پائدار ہوں یا تغیر پذیر، لوگوں کو خودکشی کی طرف لے جائیں یا لطف و مسرت کی طرف"۔

اپنے ایک دوسرے ناول "ژاک" (Jacques) میں وہ اُس شوہر کا کیرکٹر پیش کرتی ہے جو اسکے نزدیک شوہریت کا بہترین نمونہ ہو سکتا تھا۔ اسکے ہیرو ژاک کی بیوی اپنے آپ کو ایک غیر مرد کی آغوش میں ڈال دیتی ہے۔ مگر فراخ دل شوہر اس سے نفرت نہیں کرتا اور نفرت نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ جو پھول میرے بجائے کسی اور کو خوشبو دینا چاہتا ہے مجھے کیا حق ہے کہ اسے پاؤں تلے روند ڈالوں۔ آگے چل کر اسی ناول میں وہ ژاک کی زبان سے یہ خیالات ظاہر کراتی ہے:

"میں نے اپنی رائے نہیں بدلی، میں نے سوسائیٹی سے صلح نہیں کی، میری رائے میں نکاح تمام اجتماعی طریقوں میں وہ انتہائی وحشیانہ طریقہ ہے جسکا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آخر کار یہ طریقہ موقوف ہو جائیگا اگر انسانی نسل نے انصاف اور عقل کی طرف کوئی واقعی ترقی کی۔ پھر اسکی جگہ ایک دوسرا طریقہ لیگا جو نکاح سے کم مقدس نہ ہوگا مگر اس سے زیادہ انسانی طریقہ ہوگا۔ اُس وقت انسانی نسل ایسے مردوں اور ایسی عورتوں سے چلیگی جو کبھی ایک دوسرے کی آزادی پر کوئی پابندی عائد نہ کرینگے۔ فی الحال تو مرد اتنے خودغرض اور عورتیں اتنی بزدل ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی موجودہ قانون سے زیادہ شریفانہ قانون کا مطالبہ نہیں کرتا۔ ہاں! جن میں ضمیر اور نیکی کا فقدان ہے انکو تو بھاری زنجیروں میں جکڑا ہی جانا چاہیے"۔

یہ وہ خیالات ہیں جو ۱۸۳۳ء اور اسکے لگ بھگ زمانہ میں ظاہر کیے گئے تھے۔ ژورژ ساں صرف اسی حد تک جا سکی۔ اس تخیل کو اسکے آخری منطقی نتائج تک پہنچانے کی اسکو بھی ہمت نہ ہوئی۔ بااینہمہ آزادخیالی و روشن دماغی، پرانے روایتی اخلاق کی تاریکی پھر بھی کچھ نہ کچھ اسکے دماغ میں موجود تھی۔ اسکے تیس پینتیس سال کے بعد فرانس میں ڈرامانویسوں، ادیبوں اور اخلاقی فلسفیوں کا ایک دوسرا لشکر نمودار ہوا جسکے سرخیل الکساندر دوما

(Alexander Dumas) اور الفرے ناکے (Alfred Naquet) تھے۔ ان لوگوں نے سارا زور اس خیال کی اشاعت پر صرف کیا کہ آزادی اور لطف زندگی بجائے خود انسان کا پیدائشی حق ہے اور اس حق پر ضوابط اخلاق و تمدن کی جکڑ بندیاں لگانا فرد پر سوسائیٹی کا ظلم ہے۔ اس سے پہلے فرد کے لیے آزادی عمل کا مطالبہ محض محبت کے نام پر کیا جاتا تھا۔ بعد والوں کو یہ نری جذباتی بنیاد کمزور محسوس ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے انفرادی خودسری، آوارگی اور بے قید آزادی کو عقل، فلسفہ اور حکمت کی مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ نوجوان مرد اور عورتیں جو کچھ بھی کریں قلب و ضمیر کے کامل اطمینان کے ساتھ کریں اور سوسائیٹی صرف یہی نہیں کہ انکی شورش شباب کو دیکھ کر دم نہ مار سکے، بلکہ اخلاقاً جائز و مستحسن سمجھے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں پول آداں (Paul Adam) ہنری بتائی (Henry Bataille) پیر لوئی (Pierre Louys) اور دوسرے بہت سے ادیبوں نے اپنا تمام زور نوجوانوں میں جرأت رندانہ پیدا کرنے پر صرف کیا تاکہ قدیم اخلاقی تصورات کے بچے کھچے اثرات سے جو جھجک اور رکاوٹ طبیعتوں میں باقی ہے وہ نکل جائے۔ چنانچہ پول آداں اپنی کتاب (Le Morale de l'amour) میں نوجوانوں کو انکی اس جہالت و حماقت پر دل کھول کر ملامت کرتا ہے کہ وہ جس (لڑکی یا لڑکے) سے محبت کے تعلقات قائم کرتے ہیں اس کو جھوٹ موٹ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس پر مرتے ہیں اور اس سے حقیقی عشق رکھتے ہیں، اور ہمیشہ اسی کے ہو کر رہینگے۔ پھر کہتا ہے:

> "یہ سب باتیں اسلیے کی جاتی ہیں کہ جسمانی لذت کی اس صحیح خواہش کو، جو فطری طور پر ہر آدمی میں ہوتی ہے اور جس میں کوئی بات فی الواقع گناہ یا برائی کی نہیں ہے، پرانے خیالات کی بنا پر معیوب سمجھا جاتا ہے اور اسلیے آدمی خواہ مخواہ جھوٹے الفاظ کے پردے میں اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ لاطینی قوموں کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ ان میں محبت کرنے والے جوڑے ایک دوسرے پر اس بات کا صاف صاف اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ ملاقات سے انکا مقصد محض ایک جسمانی خواہش کو پورا کرنا اور لطف اٹھانا ہے"

اور اس کے بعد جوانوں کو مشورہ دیتا ہے:

"شائستہ اور معقول انسان بنو۔ اپنی خواہشات اور لذات کے خلوص[1] کو اپنا معبود نہ بنالو۔ نادان ہے وہ جو محبت کا مندر تعمیر کرکے اس میں ایک ہی بت کا پجاری بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ لطف کی ہر گھڑی میں ایک نئے مہمان کا انتخاب کرنا چاہیے"!

پیر لوئی نے ان سب سے چار قدم آگے بڑھ کر پورے زور کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا کہ اخلاق کی بندشیں دراصل انسانی ذہن اور دماغی قوتوں کے نشوونما میں حائل ہوتی ہیں، جب تک ان کو بالکل توڑ نہ دیا جائے اور انسان پوری آزادی کے ساتھ جسمانی لذات سے متمتع نہ ہو، کوئی عقلی، علمی اور مادی و روحانی ارتقاء ممکن نہیں ہے۔ اپنی کتاب "افرودیت" (Aphrodite) میں وہ نہایت شدومد کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بابل، اسکندریہ، ایتھنز، روم، وینس اور تمدن و تہذیب کے تمام دوسرے مرکزوں کی بہار اور عروج و شباب کا زمانہ وہ تھا جب وہاں رندی، آوارگی اور نفس پرستی (licentiousness) پورے زور پر تھی، مگر جب وہاں اخلاقی اور قانونی بندشیں انسانی خواہشات پر عائد ہوئیں تو خواہشات کے ساتھ ساتھ آدمی کی رُوح بھی انہی بندشوں میں جکڑ گئی!

یہ پیر لوئی وہ شخص ہے جو اپنے عہد میں فرانس کا نامور ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، اور ادب کے ایک مستقل اسکول کا رہنما تھا۔ اسکے جلو میں افسانہ نگاروں، ڈرامانویسوں اور اخلاقی مسائل پر لکھنے والوں کا ایک لشکر کا لشکر تھا جو اسکے خیالات کو پھیلانے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے قلم کی پوری طاقت عریانی اور تعلقات مرد و زن کی بے قیدی کو سراہنے میں صرف کر دی۔ اپنی اسی کتاب "افرودیت" میں وہ یونان کے اس دور کی حمد و ثنا کرتا ہے:

---

[1] اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی نہ کیجیے۔ ان سے مراد وہ عورتیں یا مرد ہیں جن کو ایک مرد یا عورت اپنی خواہشات نفسانی کی تسکین کے لیے استعمال کرے۔

"جبکہ برہنہ انسانیت ـــــ مکمل ترین صورت جسکا ہم تصور کر سکتے ہیں، اور جس کے متعلق اہل مذہب نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ خدا نے اسے خود اپنی صورت پر پیدا کیا ہے ـــــ ایک مقدس بیسوا کی شکل میں با ہزاراں ناز و ادا اپنے آپ کو ۲۰ ہزار زائرین کے سامنے پیش کر سکتی تھی۔ جبکہ کمال درجہ کی شہوانی محبت ـــــ وہی متبرک آسمانی محبت جس سے ہم سب پیدا ہوئے ہیں ـــــ نہ گناہ تھی، نہ شرم کی چیز تھی، نہ گندی اور نجس تھی۔"

حد یہ ہے کہ تمام شاعرانہ پردوں کو ہٹا کر اس نے صاف الفاظ میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہم کو:

"نہایت پر زور اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے اس مکروہ خیال کا استیصال کر دینا چاہیے کہ عورت کا ماں ہونا کسی حال میں شرمناک، ناجائز، ذلیل اور پایۂ شرف و عزت سے گرا ہوا بھی ہوتا ہے۔"

بیسویں صدی کی ترقیات انیسویں صدی میں خیالات کی ترقی یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں نئے شاہباز فضا میں نمودار ہوتے ہیں جو اپنے پیش رؤوں سے بھی اونچے اڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں پیرو ولف (Pierre Wolff) اور گیستاں لیرو (Gaston Leroux) کا ایک ڈراما (Le Lys) نکلا جس میں دو لڑکیاں اپنے جوان بھائی کے سامنے اپنے باپ سے اس مسئلے پر بحث کرتی نظر آتی ہیں کہ انہیں آزادانہ محبت کرنیکا حق ہے، اور یہ کہ "دل لگی" کے بغیر زندگی گزارنا ایک جوان لڑکی کے لیے کس قدر المناک ہوتا ہے۔ ایک صاحبزادی کو بوڑھا باپ اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ وہ ایک نوجوان سے ناجائز تعلقات رکھتی ہے۔ اسکی جواب میں صاحبزادی فرماتی ہیں:۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، تم نے کبھی یہ سمجھا ہی نہیں کہ کسی شخص کو کسی لڑکی سے، خواہ وہ اسکی بہن یا بیٹی ہی کیوں نہ ہو، یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ محبت کیے بغیر بوڑھی ہو جائے۔"

جنگ عظیم نے اس آزادی کی تحریک کو اور زیادہ بڑھایا بلکہ انتہائی مراتب تک پہنچا دیا۔ منع حمل کی تحریک کا اثر سب سے زیادہ فرانس پر ہوا تھا۔ مسلسل چالیس سال سے فرانس کی شرح پیدائش گر رہی تھی۔ فرانس کے

۸۷ اضلاع میں سے صرف ۲۰ اضلاع ایسے تھے جن میں شرح پیدائش شرح اموات سے زیادہ تھی - باقی ۶۷ اضلاع میں اموات کی شرح پیدائش کی شرح سے بڑھی ہوئی تھی - بعض اضلاع ملک کا حال تو یہ تھا کہ وہاں ہر سو بچوں کی پیدائش کے مقابلہ میں ۱۳۰ - ۱۴۰ - اور ۱۶۰ تک اموات کی تعداد کا اوسط تھا - جنگ چھڑی تو عین اس وقت جبکہ فرانسیسی قوم کی موت اور زندگی کا فیصلہ درپیش تھا، فرانس کے مدبروں کو معلوم ہوا کہ قوم کی گود میں لڑنے کے قابل جوان بہت ہی کم ہیں - اگر اس وقت ان قلیل التعداد جوانوں کو بھینٹ چڑھا کر قومی زندگی کو محفوظ کر بھی لیا گیا تو دشمن کے دوسرے حملہ میں بچ جانا محال ہوگا - اس احساس نے یکایک تمام فرانس میں شرح پیدائش بڑھانے کا جنون پیدا کر دیا اور ہر طرف سے مصنفوں نے، اخبار نویسوں نے، خطیبوں نے اور حد یہ ہے کہ سنجیدہ علما، اور اہل سیاست تک نے ہم زبان ہو کر پکارنا شروع کیا کہ بچے جنو اور جناؤ، نکاح کے رسمی قیود کی کچھ پروانہ کرو، ہر وہ کنواری لڑکی اور بیوہ، جو وطن کے لیے اپنے رحم کو رضا کارانہ پیش کرتی ہے، ملامت کی نہیں عزت کی مستحق ہے - اس زمانہ میں آزادی پسند حضرات کو قدرتی شہ مل گئی تھی، اس لیے انہوں نے وقت کو سازگار دیکھ کر وہ سارے ہی نظریات پھیلا دیے جو شیطان کی زنبیل میں بچے کھچے رہ گئے تھے -

اس زمانہ کا ایک ممتاز جریدہ نگار جو لالیوں ری پبلکین (Le Lyon Republicain) کا ایڈیٹر تھا اس سوال پر بحث کرتے ہوئے کہ "زنا بالجبر آخر کیوں جرم ہے"؟ یوں اظہار خیال کرتا ہے :

"غریب لوگ جب بھوک سے مجبور ہو کر چوری اور لوٹ مار کرنے پر اتر آتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ انکو روٹی مہیا کرو، لوٹ مار آپ سے آپ چھوڑ دینگے - مگر عجیب بات ہے کہ ہمدردی اور مواساۃ کا جو جذبہ جسم کی ایک طبعی ضرورت کے مقابلہ میں ابھرتا ہے، وہ دوسری ویسی ہی طبعی اور اتنی ہی اہم ضرورت یعنی محبت کے لیے کیوں وسیع نہیں ہوتا - جس طرح چوری عموماً بھوک کی شدت کا نتیجہ ہوتی ہے اسی طرح وہ چیز جس کا نتیجہ زنا بالجبر، اور بسا اوقات قتل ہے، اُس ضرورت کے شدید تقاضے سے واقع ہوتی ہے جو بھوک اور

پیاس سے کچھ کم طبیعی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ ایک تندرست آدمی، جو توانا اور جوان ہو اپنی شہوت کو نہیں روک سکتا، جس طرح وہ اپنی بھوک کو اس وعدے پر ملتوی نہیں کر سکتا کہ آئندہ ہفتہ روٹی مل جائیگی۔ ہمارے شہروں میں، جہاں سب کچھ بافراط موجود ہے، ایک جوان آدمی کی شہوانی فاقہ کشی بھی اتنی ہی افسوسناک ہے جتنی کہ ایک مفلس آدمی کی شکمی فاقہ کشی۔ جس طرح بھوکوں کو روٹی مفت تقسیم کی جاتی ہے اسی طرح دوسری قسم کی بھوک سے جو لوگ مر رہے ہیں ان کے لیے بھی ہمیں کوئی انتظام کرنا چاہیے۔"

بس اتنا اور سمجھ لیجیے کہ یہ کوئی مزاحیہ مضمون نہ تھا۔ پوری سنجیدگی کے ساتھ لکھا گیا اور سنجیدگی ہی کے ساتھ فرانس میں پڑھا بھی گیا۔

اسی دور میں پیرس کی فیکلٹی آف مڈیسن نے ایک فاضل ڈاکٹر کا مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کرنے کے لیے پسند کیا اور اپنے سرکاری جریدہ میں اسے شائع کیا جس میں ذیل کے چند فقرے بھی پائے جاتے ہیں:

"ہمیں توقع ہے کہ کبھی وہ دن بھی آئیگا جب ہم بغیر جھوٹی تعلّی اور بغیر کسی شرم و حیا کے یہ کہدیا کرینگے کہ مجھے بیس سال کی عمر میں آتشک ہوئی تھی جس طرح اب ہم بے تکلف کہدیتے ہیں کہ مجھے خون تھوکنے کی وجہ سے پہاڑ پر بھیجدیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ امراض تو لطفِ زندگی کی قیمت ہیں۔ جس نے اپنی جوانی اس طرح بسر کی کہ ان میں سے کوئی مرض لگنے کی بھی نوبت نہ آئی وہ ایک غیر مکمل وجود ہے۔ اس نے بزدلی، یا سرد مزاجی، یا مذہبی غلط فہمی کی بنا پر اس طبیعی وظیفہ کی انجام دہی سے غفلت برتی جو اس کے فطری وظائف میں سے شائد سب سے ادنیٰ وظیفہ تھا۔"

تومالتھوسی تحریک کا لٹریچر آگے بڑھنے سے پہلے ایک نظر ان خیالات پر بھی ڈال لیجیے جو منع حمل کی تحریک کے سلسلہ میں پیش کیے گئے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں جب انگریز ماہر معاشیات مالتھوس (Malthus) نے آبادی کی روز افزوں ترقی کو روکنے کے لیے ضبط ولادت کی تجویز پیش کی

تھی اُس وقت اسکے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ اسکی یہی تجویز ایک صدی بعد زنا اور فواحش کی اشاعت میں سب سے بڑھ کر مددگار ثابت ہوگی۔ اس نے تو آبادی کی افزائش کو روکنے کے لیے ضبط نفس اور بڑی عمر میں نکاح کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر انیسویں صدی کے آخر میں جب نو مالتھوسی تحریک (Neo-Malthusian Movement) اٹھی تو اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ نفس کی خواہش کو آزادی کے ساتھ پورا کیا جائے اور اسکے فطری نتیجہ، یعنی اولاد کی پیدائش کو سائنٹفک ذرائع سے روک دیا جائے۔ اس چیز نے بدکاری کے راستے سے وہ آخری رکاوٹ بھی دور کردی جو آزاد صنفی تعلقات رکھنے میں مانع ہو سکتی تھی، کیونکہ اب ایک عورت بلا اس خوف کے اپنے آپکو ایک مرد کے حوالے کر سکتی ہے کہ اس سے اولاد ہوگی اور اس پر ذمہ داری کا بوجھ آن پڑیگا۔ اسکے نتائج بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ یہاں ہم ان خیالات کے چند نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں جو برتھ کنٹرول کے لٹریچر میں کثرت کے ساتھ پھیلائے گئے ہیں۔

اس لٹریچر میں نو مالتھوسی مقدمہ عموماً جس طرز استدلال کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے:

"ہر انسان کو فطری طور پر تین سب سے زیادہ قاہر اور پر زور حاجتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک غذا کی حاجت، دوسرے آرام کی حاجت، اور تیسری شہوت۔ فطرت نے ان تینوں کو پوری قوت کے ساتھ انسان میں ودیعت کر دیا ہے، اور انکی تسکین میں خاص لذت رکھی ہے تاکہ انسان انکی تسکین کا خواہشمند ہو۔ عقل اور منطق کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی انہیں پورا کرنے کی طرف لپکے۔ اور پہلی دو چیزوں کے معاملہ میں اسکا طرز عمل بھی یہی ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تیسری چیز کے معاملہ میں اسکا طرز عمل مختلف ہے۔ اجتماعی اخلاق نے اس پر یہ پابندی لگادی ہے کہ صنفی خواہش کو حدود نکاح سے باہر پورا نہ کیا جائے۔ اور حدود نکاح میں زن و شو کے لیے وفاداری اور عصمت آبی فرض کردی گئی ہے۔ اور اس پر مزید یہ بھی شرط لگادی گئی ہے کہ اولاد کی پیدائش کو روکا نہ جائے۔ یہ سب باتیں سراسر لغو ہیں، عقل اور فطرت کے خلاف ہیں، عین اپنے اصول میں غلط ہیں، اور انسانیت کے لیے بدترین نتائج پیدا کرنے والی ہیں۔" ان مقدمات پر جن خیالات کی عمارت تعمیر ہوتی ہے وہ ملاحظہ ہوں۔

جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا لیڈر ریبل (Rabel) نہایت بے تکلفانہ انداز میں لکھتا ہے:

"عورت اور مرد آخر حیوان ہی تو ہیں۔ کیا حیوانات کے جوڑوں میں نکاح اور وہ بھی دائمی نکاح کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے"؟

ڈاکٹر ڈریسڈیل (Drysdale) لکھتا ہے:

"ہماری تمام خواہشات کی طرح محبت بھی ایک تغیر پذیر چیز ہے۔ اسکو ایک ہی طریقہ کے ساتھ مخصوص کر دینا قوانین فطرت میں ترمیم کرنا ہے۔ نوجوان خصوصیت کے ساتھ اس تغیر کی طرف رغبت رکھتے ہیں، اور انکی یہ رغبت فطرت کے اس عظیم الشان منطقی نظام کے مطابق ہے جسکا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے تجربات میں تنوع ہو۔ .... آزاد تعلق ایک برتر اخلاق کا مظہر ہے اسلیے کہ وہ قوانین فطرت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، اور اسلیے بھی کہ وہ براہِ راست جذبات، احساس اور بے غرض محبت سے ظہور میں آتا ہے۔ جس میلان و رغبت سے یہ تعلق واقع ہوتا ہے وہ بڑی اخلاقی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ یہ بات بھلا اُس تجارتی کاروبار کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے جو نکاح کو درحقیقت پیشہ (Prostitution) بنا دیتا ہے"۔

دیکھیے اب نظریہ بدل رہا ہے بلکہ الٹ رہا ہے۔ پہلے تو یہ کوشش تھی کہ زنا کو اخلاقاً معیوب سمجھنے کا خیال دلوں سے نکل جائے، اور نکاح و سفاح دونوں مساوی الدرجہ ہو جائیں۔ اب آگے قدم بڑھا کر نکاح کو معیوب اور سفاح کو اخلاقی برتری کا مرتبہ دلوایا جا رہا ہے۔

ایک اور موقع پر یہی ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ شادی کے بغیر بھی محبت کو ایک معزز چیز بنا دیا جائے ...

... یہ خوشی کی بات ہے کہ طلاق کی آسانی اس نکاح کے طریقہ کو آہستہ آہستہ ختم کر رہی ہے کیونکہ اب نکاح بس دو اشخاص کے درمیان مل کر زندگی بسر کرنے کا ایسا معاہدہ ہے جسکو فریقین جب چاہیں ختم

کر سکتے ہیں ۔ یہ صنفی ارتباط کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے "

فرانس کا مشہور نومالتھوسی لیڈر پول روبین (Paul Robin) لکھتا ہے :

" پچھلے ۲۵ سال میں ہم کو اتنی کامیابی تو ہو چکی ہے کہ حرامی بچہ کو قریب قریب حلالی بچہ کا ہم مرتبہ کر دیا گیا ہے ۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم کے بچے پیدا ہوا کریں تاکہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے "

انگلستان کا مشہور فلسفی مِل اپنی کتاب "آزادی" (On Liberty) میں اس بات پر بڑا زور دیتا ہے کہ ایسے لوگوں کو شادی کرنے سے قانوناً روک دیا جائے جو اس بات کا ثبوت نہ دے سکیں کہ وہ زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ذرائع رکھتے ہیں ۔ لیکن جس وقت انگلستان میں قحبہ گری (Prostitution) کی روک تھام کا سوال اٹھا تو اسی فاضل فلسفی نے بڑی سختی کے ساتھ اسکی مخالفت کی ۔ دلیل یہ تھی کہ یہ شخصی آزادی پر حملہ ہے اور ورکرز کی توہین ہے ، کیونکہ یہ تو اسکے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرنا ہوا !

غور کیجیے ، شخصی آزادی کا احترام صرف اسلیے ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر زنا کی جائے ۔ لیکن اگر کوئی احمق اسی شخصی آزادی سے فائدہ اٹھا کر نکاح کرتا ہے تو وہ ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسکی آزادی کا تحفظ کیا جائے ۔ اسکی آزادی میں تو قانون کی مداخلت نہ صرف گوارا کی جائیگی بلکہ آزادی پسند فلسفی کا ضمیر اسکو عین مطلوب قرار دیگا ! یہاں اخلاقی نظریہ کا انقلاب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے ۔ جو عیب تھا وہ صواب ہو گیا ۔ جو صواب تھا وہ عیب ہو گیا ۔

نتائج

لٹریچر پیش قدمی کرتا ہے۔ رائے عام اسکے پیچھے آتی ہے۔ آخر میں اجتماعی اخلاق، سوسائٹی کے ضوابط اور حکومت کے قوانین سب سپر ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں پیہم ڈیڑھ سو سال تک فلسفہ، تاریخ، اخلاقیات، فنونِ حکومت، ناول، ڈراما، تھیٹر، آرٹ، غرض دماغوں کو تیار کرنے والے اور ذہنوں کو ڈھالنے والے تمام آلات اپنی متحدہ طاقت کے ساتھ ایک ہی طرزِ خیال کو انسانی ذہن کے ریشہ ریشہ میں پیوست کرتے رہیں وہاں اس طرزِ خیال سے سوسائٹی کا متاثر نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ پھر جس جگہ حکومت اور ساری اجتماعی تنظیمات کی بنیاد جمہوری اصولوں پر ہو وہاں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ رائے عام کی تبدیلی کے ساتھ قوانین میں تغیر نہ ہو۔

صنعتی انقلاب اور اسکے اثرات اتفاق یہ کہ عین وقت پر دوسرے تمدنی اسباب بھی سازگار ہوگئے۔ اسی زمانہ میں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) رونما ہوا۔ اس سے معاشی زندگی میں جو تغیرات واقع ہوئے، اور تمدنی زندگی پر اُن سے جو اثرات مترتب ہوئے وہ سب کے سب حالات کا رُخ اسی سمت میں پھیر دینے کے لیے تیار تھے جدھر یہ انقلابی لٹریچر انہیں پھیرنا چاہتا تھا۔ شخصی آزادی کے جس تصور پر نظام سرمایہ داری کی تعمیر ہوئی تھی اُسکو مشین کی ایجاد اور کثیر پیداآوری (Mass production) کے امکانات نے غیر معمولی قوت بہم پہنچادی۔ سرمایہ دار طبقوں نے بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی ادارے قائم کیے۔ صنعت و تجارت کے نئے مرکز رفتہ رفتہ عظیم الشان شہر بن گئے۔ دیہات و مفصلات سے لاکھوں کروروں انسان کھنچ کھنچ کران شہروں میں جمع ہوتے چلے گئے۔ زندگی حد سے زیادہ گراں ہوگئی۔ مکان، لباس، غذا، اور تمام ضروریات زندگی پر آگ برسنے لگی۔ کچھ ترقی تمدن

کے سبب سے اور کچھ سرمایہ داروں کی کوششوں سے بے شمار نئے اسباب عیش بھی زندگی کی ضروریات میں داخل ہو گئے۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام نے دولت کی تقسیم اس طرز پر نہیں کی کہ جن آسائشوں اور لذتوں اور آرائشوں کو اس نے زندگی کی ضروریات میں داخل کیا تھا انہیں حاصل کرنے کے وسائل بھی اسی پیمانہ پر سب لوگوں کو بہم پہنچاتا۔ اس نے تو عوام کو اتنے وسائل معیشت بھی بہم نہ پہنچائے کہ جن بڑے بڑے شہروں میں وہ ان کو گھسیٹ لایا تھا، وہاں کم از کم زندگی کی حقیقی ضروریات —— مکان، غذا اور لباس وغیرہ —— ہی انکو بآسانی حاصل ہوسکتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہر پر بیوی، اور باپ پر اولاد تک بارِ گراں بن گئی۔ ہر شخص کے لیے خود اپنے آپ ہی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا کجا کہ وہ دوسرے متعلقین کا بوجھ اٹھائے۔ معاشی حالات نے مجبور کر دیا کہ ہر فرد کمانے والا فرد بن جائے۔ کنواری اور شادی شدہ اور بیوہ سب ہی قسم کی عورتوں کو رفتہ رفتہ کسب رزق کے لیے نکل آنا پڑا۔ پھر جب دونوں صنفوں میں ربط و اختلاط کے مواقع زیادہ بڑھے اور اسکے فطری نتائج ظاہر ہونے لگے تو اسی شخصی آزادی کے تصور اور اسی نئے فلسفۂ اخلاق نے آگے بڑھ کر باپوں اور بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں، شوہروں اور بیویوں، سب کو اطمینان دلایا کہ کچھ گھبرانے کی بات نہیں، جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے، یہ گراوٹ نہیں اٹھان (emancipation) ہے، یہ بداخلاقی نہیں عین لطف زندگی ہے، یہ گڑھا جس میں سرمایہ دار تمہیں پھینک رہا ہے دوزخ نہیں جنت ہے جنت!

سرمایہ دارانہ خود غرضی اور معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ حریت شخصی کے اس تصور پر جس نظام سرمایہ داری کی بنا اٹھائی گئی تھی اس نے فرد کو ہر ممکن طریقہ سے دولت کمانے کا غیر مشروط اور غیر محدود اجازت نامہ دیدیا، اور نئے فلسفۂ اخلاق نے ہر اس طریقہ کو حلال وطیّب ٹھیرایا جس سے دولت کمائی جاسکتی ہو، خواہ ایک شخص کی دولت مندی کتنے ہی اشخاص کی تباہی کا نتیجہ ہو۔ اس طرح تمدن کا سارا نظام ایسے طریقہ پر بنا کہ جماعت کے مقابلہ میں ہر پہلو سے فرد کی حمایت تھی اور فرد کی خود غرضیوں کے مقابلہ میں جماعت کے لیے تحفظ کی

کوئی صورت نہ تھی۔ خودغرض افراد کے لیے سوسائٹی پر تاخت کرنے کے سارے راستے کھل گئے۔ انہوں نے تمام انسانی کمزوریوں کو چن چن کر تاکا، اور انہیں اپنی اغراض کے لیے استعمال (exploit) کرنے کے نت نئے طریقے اختیار کرنے شروع کیے۔ ایک شخص اٹھتا ہے اور وہ اپنی جیب بھرنے کے لیے لوگوں کو شراب نوشی کی لعنت میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے۔ کوئی نہیں جو سوسائٹی کو اس طاعون کے چوہے سے بچائے۔ دوسرا اٹھتا ہے اور وہ سودخواری کا جال دنیا بھر میں پھیلا دیتا ہے۔ کوئی نہیں جو اس جونک سے لوگوں کے خونِ حیات کی حفاظت کرے ــــ بلکہ سارے قوانین اسی جونک کے مفاد کی حفاظت کر رہے ہیں تاکہ کوئی اس سے ایک قطرۂ خون بھی نہ بچا سکے ــــ تیسرا اٹھتا ہے اور وہ قماربازی کے عجیب عجیب طریقے رائج کرتا ہے، حتیٰ کہ تجارت کے بھی کسی شعبہ کو قمار کے عنصر سے خالی نہیں چھوڑتا۔ کوئی نہیں جو اس تپِ محرقہ سے انسان کی حیاتِ معاشی کا تحفظ کرے۔ انفرادی خودسری اور بغی و عدوان کے اس ناپاک دور میں غیر ممکن تھا کہ خودغرض افراد کی نظر انسان کی اس بڑی اور شدید ترین کمزوری ــــ شہوانیت ــــ پر نہ پڑتی جس کو بھڑکا کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس سے بھی کام لیا گیا اور اتنا کام لیا گیا جتنا لینا ممکن تھا۔ تھیٹروں میں، رقص گاہوں میں، اور فلم سازی کے مرکزوں میں سارے کاروبار کا مدار ہی اس پر قرار پایا کہ خوبصورت سے خوبصورت عورتوں کی خدمات حاصل کی جائیں، انکو زیادہ سے زیادہ برہنہ اور زیادہ سے زیادہ ہیجان انگیز صورت میں منظرِ عام پر پیش کیا جائے، اور اس طرح لوگوں کی شہوانی پیاس کو زیادہ سے زیادہ بھڑکا کر انکی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ کچھ دوسرے لوگوں نے عورتوں کو کرایہ پر چلانے کا انتظام کیا اور قحبہ گری کے پیشہ کو ترقی دیکر ایک نہایت منظم بین الاقوامی تجارت کی حد تک پہنچا دیا۔ کچھ اور لوگوں نے زینت و آرائش کے عجیب عجیب سامان نکالے اور انکو خوب پھیلایا تاکہ عورتوں کے پیدائشی جذبۂ حسن آرائی کو بڑھا کر دیوانگی تک پہنچا دیں اور اس طرح دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹیں۔ کچھ اور لوگوں نے لباس کے نئے شہوت انگیز اور عریاں فیشن نکالے، اور خوبصورت عورتوں کو اسلیے مقرر کیا کہ وہ انہیں پہن کر سوسائٹی میں پھریں، تاکہ نوجوان مرد کثرت سے انکی طرف راغب ہوں، اور نوجوان لڑکیوں میں ان لباسوں

کے پہننے کا شوق پیدا ہو اور اس طرح موجد لباس کی تجارت فروغ پائے۔ کچھ اور لوگوں نے برہنہ تصویروں اور فحش مضامین کی اشاعت کو روپیہ کھینچنے کا ذریعہ بنایا اور اس طرح عوام کو اخلاقی جذام میں مبتلا کر کے خود اپنی جیبیں بھرنی شروع کیں۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشکل ہی سے تجارت کا کوئی شعبہ ایسا باقی رہ گیا ہو جس میں شہوانیت کا عنصر شامل نہ ہو۔ کسی تجارتی کاروبار کے اشتہار کو دیکھ لیجیے۔ عورت کی برہنہ یا نیم برہنہ تصویر اس کا جزو لاینفک ہوگی۔ گویا عورت کے بغیر اب کوئی اشتہار اشتہار ہی نہیں ہو سکتا۔ ہوٹل، ریسٹراں، شو روم، کوئی جگہ آپ کو ایسی نہ ملیگی جہاں عورت اس غرض سے نہ رکھی گئی ہو کہ مرد اسکی طرف کھنچ کر آئیں۔ غریب سوسائٹی جس کا کوئی محافظ نہیں، صرف ایک ہی ذریعہ سے اپنے مفاد کی حفاظت کر سکتی تھی کہ خود اپنے اخلاقی تصورات سے ان حملوں کی مدافعت کرتی اور اس شہوانیت کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دیتی۔ مگر نظام سرمایہ داری ایسی کچی بنیادوں پر نہیں اٹھا تھا کہ یوں اسکے حملہ کو رد کیا جا سکتا۔ اسکے ساتھ ایک مکمل فلسفہ اور ایک زبردست شیطانی لشکر ــــ لٹریچر بھی تو تھا جو ساتھ ساتھ اخلاقی نظریات کی شکست و ریخت بھی کرتا جا رہا تھا۔ قاتل کا کمال یہی ہے کہ جسے قتل کرنے جائے اسکو بطوع و رغبت قتل ہونے کے لیے تیار کر دے۔

جمہوری نظام سیاست مصیبت اتنے پر بھی ختم نہ ہوئی۔ مزید براں، اسی تصور آزادی نے مغرب میں جمہوری نظام حکمرانی کو جنم دیا جو اس اخلاقی انقلاب کی تکمیل کا ایک طاقتور ذریعہ بن گیا۔

جمہوریت جدیدہ کا اصل الاصول یہ ہے کہ لوگ خود اپنے حاکم اور خود اپنے قانون ساز ہیں، جیسے قوانین چاہیں اپنے لیے بنائیں اور جن قوانین کو پسند نہ کریں ان میں جیسی چاہیں ترمیم و تنسیخ کر دیں۔ ان کے اوپر کوئی ایسا بالاتر اقتدار نہیں جو انسانی کمزوریوں سے پاک ہو اور جسکی ہدایت و رہنمائی کے آگے سر جھکا کر انسان بے راہ روی سے بچ سکتا ہو۔ انکے لیے کوئی ایسا اساسی قانون نہیں جو اٹل ہو اور انسان کی دست رس سے باہر ہو اور جسکے اصولوں کو ناقابل ترمیم و تنسیخ مانا جائے۔ ان کے لیے کوئی ایسا معیار نہیں جو صحیح اور غلط کی تمیز کے لیے کسوٹی ہو اور انسانی اہواء اور خواہشات کے ساتھ بدلنے والا نہ ہو بلکہ ثابت اور مستقل ہو۔ اس طرح جمہوریت کے جدید نظریہ

نے انسان کو بالکل خود مختار اور غیر ذمہ دار فرض کرکے آپ ہی اپنا شارع بنا دیا اور ہر قسم کی قانون سازی کا مدار صرف رائے عام پر رکھا۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جہاں اجتماعی زندگی کے سارے قوانین رائے عام کے تابع ہوں، اور جہاں حکومت اسی جمہوریت جدیدہ کے الٰہ کی عبد ہو، وہاں قانون اور سیاست کی طاقتیں کسی طرح سوسائٹی کو اخلاقی فساد سے نہیں بچا سکتیں، بلکہ بچانا کیا معنی، آخر کار وہ خود اس کو تباہ کرنے میں معین و مددگار بن کر رہینگی۔ رائے عام کے ہر تغیر کے ساتھ قانون بھی بدلتا چلا جائیگا۔ جوں جوں عام لوگوں کے نظریات بدلینگے، قانون کے اصول اور ضوابط بھی انکے مطابق ڈھلتے جائینگے۔ حق اور خیر اور صلاح کا کوئی معیار اسکے سوا نہ ہوگا کہ ووٹ کس طرف زیادہ ہیں۔ ایک تجویز، خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی ناپاک کیوں نہ ہو، اگر عوام میں اتنی قبولیت حاصل کر چکی ہے کہ ۱۰۰ میں سے ۵۱ ووٹ حاصل کر سکتی ہے، تو اسکو تجویز کے مرتبہ سے ترقی کرکے شریعت بنجانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اسکی بدترین عبرت انگیز مثال وہ ہے جو نازی دور سے پہلے جرمنی میں ظاہر ہوئی۔ جرمنی میں، ایک صاحب ڈاکٹر ماگنوس ہرشفیلد (Magnus Hirschfeld) ہیں جو دنیا کی مجلس اصلاح صنفی (World' League of Sexual Reform) کے صدر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے عمل قوم لوط کے حق میں چھ سال تک زبردست پروپیگنڈا کیا۔ آخر کار جمہوریت کا الٰہ اِس حرام کو حلال کر دینے پر راضی ہو گیا اور جرمن پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے طے کر دیا کہ اب یہ فعل جرم نہیں ہے بشرطیکہ طرفین کی رضامندی سے اس کا ارتکاب کیا جائے، اور معمول کے نابالغ ہونے کی صورت میں اسکا ولی ایجاب و قبول کی رسم ادا کر دے!

قانون اس جمہوری الٰہ کی عبادت میں ذرا نسبتہً سست کار واقع ہوا ہے۔ اُسکے اوامر کا اتباع کرتا تو ہے مگر کسل اور کاہلی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ نقص جو عبودیت کی تکمیل میں باقی رہ گیا ہے، اسکی کسر حکومت کے انتظامی کل پُرزے پورے کر دیتے ہیں۔ جو لوگ اِن جمہوری حکومتوں کے کاروبار چلاتے ہیں وہ قانون سے پہلے اس لٹریچر اور اُن اخلاقی فلسفوں کا، اور اُن عام رجحانات کا اثر قبول کر لیتے ہیں جو ان کے گرد و پیش پھیلے ہوئے ہوتے ہیں،

انکی عنایت سے ہر وہ بد اخلاقی سرکاری طور پر تسلیم کر لی جاتی ہے جسکا رواج عام ہوگیا ہو۔ جو چیزیں قانوناً ابھی تک ممنوع ہیں ان کے معاملہ میں عملاً پولیس اور عدالتیں قانون کے نفاذ سے احتراز کرتی ہیں اور اس طرح وہ گویا حلال کے درجے میں ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اسقاط ہی کو لے لیجیے جو مغربی قوانین میں اب بھی حرام ہے مگر کوئی ملک ایسا نہیں جہاں علی الاعلان اور بکثرت اس کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو۔ انگلستان میں کم سے کم اندازہ کے مطابق ہر سال ۹۰ ہزار حمل اسقاط کیے جاتے ہیں۔ شادی شدہ عورتوں میں سے کم از کم ۲۵ فیصدی ایسی ہیں جو یا تو خود اسقاط کر لیتی ہیں یا کسی ماہر فن کی مدد حاصل کرتی ہیں۔ غیر شادی شدہ عورتوں میں اس کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہے۔ بعض مقامات پر عملاً باقاعدہ اسقاط کلب قائم ہیں جنکو خواتین کرام ہفتہ وار فیس ادا کرتی رہتی ہیں تاکہ موقع پیش آنے پر ایک ماہر اسقاط کی خدمات آسانی سے حاصل ہو جائیں۔ لندن میں ایسے بہت سے نرسنگ ہوم ہیں جہاں زیادہ تر مریضات وہ ہوتی ہیں جنہوں نے اسقاط کرایا ہوتا ہے[1]۔ اسکے باوجود انگلستان کی کتاب آئین میں اسقاط ابھی تک جرم ہی ہے۔

حقائق و شواہد اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تینوں عناصر، یعنی جدید اخلاقی نظریات، سرمایہ دارانہ نظام تمدن، اور جمہوری نظام سیاسی، مل جل کر اجتماعی اخلاق اور مرد و عورت کے صنفی تعلق کو کس طرح متاثر کر رہے ہیں اور ان سے فی الواقع کس قسم کے نتائج رونما ہوئے ہیں۔ چونکہ اسوقت تک میں نے زیادہ تر سرزمین فرانس کا ذکر کیا ہے جہاں سے اس تحریک کا آغاز ہوا تھا، لہذا میں سب سے پہلے فرانس ہی کو شہادت میں پیش کرونگا[2]۔

اخلاقی حس کا تعطل پچھلے باب میں جن نظریات کا ذکر کیا جاچکا ہے انکی اشاعت کا اولین اثر یہ ہوا کہ صنفی معاملات میں لوگوں کی اخلاقی حس مفلوج ہونے لگی۔ شرم و حیا اور غیرت و حمیت روز بروز مفقود ہوتی چلی گئی۔

[1] یہ تفصیلات پروفیسر جوڈ نے اپنی کتاب (Guide to Modern Wickedness) میں بیان کی ہیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

[2] میں نے زیادہ تر ان معلومات کا استفادہ ایک ممتاز فرانسیسی عالم عمرانیات پول بیورو (Paul Bureau) کی کتاب (Towards Moral Bankruptcy) سے کیا ہے جو ۱۹۲۵ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔

نکاح و سفاح کی تمیز دلوں سے نکل گئی، اور زنا ایک ایسی معصوم چیز بن گئی جسے اب کوئی عیب یا قباحت کی بات سمجھا ہی نہیں جاتا کہ اس کو چھپانے کا اہتمام کیا جائے۔

انیسویں صدی کے وسط بلکہ اخیر تک عام فرانسیسیوں کے اخلاقی نظریہ میں صرف اتنا تغیر ہوا تھا کہ مردوں کے لیے زنا کو بالکل ایک معمولی، فطری چیز سمجھا جاتا تھا، والدین اپنے نوجوان لڑکوں کی آوارگی کو (بشرطیکہ وہ امراض خبیثہ یا کسی عدالتی کارروائی کی موجب نہ بن جائے) بخوشی گوارا کرتے تھے، بلکہ اگر وہ مادی حیثیت سے مفید ہو تو اس پر خوش بھی ہوتے تھے، اور ان کے خیال میں کسی مرد کا کسی عورت سے نکاح کے بغیر تعلق رکھنا کوئی معیوب فعل نہ تھا۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ والدین نے اپنے نوجوان لڑکوں پر خود زور دیا ہے کہ کسی بااثر یا مالدار عورت سے تعلقات قائم کرکے اپنا مستقبل درخشاں بنائیں۔ لیکن اس وقت تک عورت کے معاملہ میں نظریہ اس سے بہت مختلف تھا۔ عورت کی عصمت بہرحال ایک قیمتی چیز سمجھی جاتی تھی۔ وہی والدین جو اپنے لڑکے کی آوارگی کو جوانی کی ترنگ سمجھ کر گوارا کرلیتے تھے، اپنی لڑکی کے دامن پر کوئی داغ دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ بدکار مرد جس طرح بے عیب سمجھا جاتا تھا، بدکار عورت اُس طرح بے عیب نہ سمجھی جاتی تھی۔ بیشہ ور فاحشہ کا ذکر جس ذلت کے ساتھ کیا جاتا تھا، اس کے پاس جانے والے مرد کے حصہ میں وہ ذلت نہ آتی تھی۔ اسی طرح ازدواجی رشتے میں بھی عورت اور مرد کی اخلاقی ذمہ داری مساوی نہ تھی۔ شوہر کی بدکاری گوارا کرلی جاتی تھی مگر بیوی کی بدکاری ایک سخت چیز تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز تک پہنچتے پہنچتے یہ صورت حال بدل گئی۔ تحریک آزادی نسواں نے عورت اور مرد کی اخلاقی مساوات کا جو صور پھونکا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ عام طور پر عورت کی بدکاری کو بھی اسی طرح غیر معیوب سمجھنے لگے جس طرح مرد کی بدکاری کو سمجھتے تھے، اور نکاح کے بغیر کسی مرد سے تعلق رکھنا عورت کے لیے بھی کوئی ایسا فعل نہ رہا جس سے اس کی شرافت و عزت پر بٹہ لگتا ہو۔ پول بیورو لکھتا ہے:

"نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ فرانس کے قصبات و دیہات تک میں اب نوجوان مرد اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب ہم عفیف نہیں ہیں تو ہمیں اپنی منگیتر سے بھی عفت کا مطالبہ کرنے کا، اور یہ چاہنے

کا کر وہ انہیں کنواری ملے، کوئی حق نہیں ہے۔ برگنڈی، یون اور دوسرے علاقوں میں اب یہ عام بات ہے کہ ایک لڑکی شادی سے پہلے بہت سی "دوستیاں" کر چکتی ہے اور شادی کے وقت اسے اپنے منگیتر سے اپنی گزشتہ زندگی کے حالات چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ لڑکی کے قریب ترین رشتہ داروں میں بھی اسکی بدچلنی پر کسی قسم کی ناپسندیدگی نہیں پائی جاتی۔ وہ اسکی "دوستیوں" کا ذکر آپس میں اس طرح بے تکلفانہ کرتے ہیں گویا کسی کھیل یا روزگار کا ذکر ہے۔ اور نکاح کے موقع پر دولہا صاحب، جو اپنی دلہن کی سابق زندگی ہی سے نہیں بلکہ اُس کے اُن "دوستوں" تک سے واقف ہوتے ہیں جو اب تک اس کے جسم سے لطف اٹھاتے رہے ہیں، اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو اس بات کا شبہ تک نہ ہونے پائے کہ انہیں اپنی دلہن کے ان مشاغل پر کسی درجہ میں بھی کوئی اعتراض ہے۔" (صفحہ ۹۴)

آگے چل کر لکھتا ہے:-

"فرانس میں متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ صورت حال بکثرت دیکھی جاتی ہے، اور اب اس میں قطعاً کوئی غیر معمولی پن نہیں رہا ہے کہ ایک اچھے خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی، جو کسی دفتر یا تجارتی فرم میں ایک اچھی جگہ پر کام کرتی ہے، اور شائستہ سوسائٹی میں اٹھتی بیٹھتی ہے، کسی نوجوان سے مانوس ہوگئی اور اسکے ساتھ رہنے لگی۔ اب یہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ شادی کریں۔ دونوں شادی کے بغیر ہی ایک ساتھ رہنا زیادہ مرجح سمجھتے ہیں، محض اسلیے کہ دونوں کو دل بھر جانے کے بعد الگ ہو جانے اور کہیں اور دل لگانے کی آزادی حاصل رہے۔ سوسائٹی میں انکے تعلق کی یہ نوعیت سب کو معلوم ہوتی ہے۔ شائستہ طبقوں میں دونوں مل کر جاتے آتے ہیں۔ نہ وہ خود اپنے تعلق کو چھپاتے ہیں، نہ کوئی دوسرا انکی ایسی زندگی میں کسی قسم کی برائی محسوس کرتا ہے۔ ابتدا میں یہ طرزِ عمل کارخانوں میں کام کرنے والے لوگوں نے شروع کیا تھا۔ اول اول اسکو سخت معیوب سمجھا گیا۔ مگر اب یہ اونچے طبقوں میں عام ہوگیا ہے اور اجتماعی زندگی میں اس نے وہی حیثیت حاصل کرلی ہے جو کبھی نکاح کی تھی۔" (صفحہ ۹۴-۹۶)

اس نوعیت کی داشتہ کو اب باقاعدہ تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ موسیو برتلیمی (M. Berthelemy) پیرس یونیورسٹی کا معلم قانون لکھتا ہے کہ رفتہ رفتہ "داشتہ" کو وہی قانونی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے جو پہلے "بیوی" کی تھی۔ پارلیمنٹ میں اسکا تذکرہ آنے لگا ہے۔ حکومت اسکے مفاد کی حفاظت کرنے لگی ہے ایک سپاہی کی داشتہ کو وہی نفقہ دیا جاتا ہے جو اسکی بیوی کے لیے مقرر ہے۔ سپاہی اگر مر جائے تو اسکی داشتہ کو وہی پنشن ملتی ہے جو منکوحہ بیوی کو ملتی ہے۔

فرانسیسی اخلاقیات میں زنا کے غیر معیوب ہونے کی کیفیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں ایک مدرسہ کی معلمہ مس ہونے کے باوجود حاملہ پائی گئی۔ محکمۂ تعلیم میں کچھ پرانے خیال کے لوگ بھی موجود تھے۔ انہوں نے ذرا شور مچایا۔ اس پر معززین کا ایک وفد وزارت تعلیم میں حاضر ہوا اور اسکے حسب ذیل دلائل اتنے وزنی پائے گئے کہ معلمہ کا معاملہ رفع دفع کر دیا گیا:

(۱) کسی کی پرائیویٹ زندگی سے لوگوں کو کیا مطلب؟

(۲) اور پھر اس نے آخر کس جرم کا ارتکاب کیا ہے؟

(۳) اور کیا نکاح کے بغیر ماں بننا زیادہ جمہوری طریقہ نہیں ہے؟

فرانسیسی فوج میں سپاہیوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں منجملہ دوسرے ضروری مسائل کے یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ امراض خبیثہ سے محفوظ رہنے اور حمل روکنے کی کیا تدابیر ہیں۔ گویا یہ بات تو مسلّم ہی ہے کہ ہر سپاہی زنا ضرور کریگا۔ ۲ رمئی ۱۹۱۹ء کو فرانس کی ۱۲۷ ویں ڈویژن کے کمانڈر نے سپاہیوں کے نام ایک اعلان عام شائع کیا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

"معلوم ہوا ہے کہ فوجی قحبہ خانوں پر بندوقچیوں کے ہجوم کی وجہ سے عام سوار اور پیادہ فوج کے سپاہیوں کو شکایت ہے۔ وہ گلہ کرتے ہیں کہ بندوقچیوں نے ان جگہوں پر اپنا اجارہ قائم کر لیا ہے اور وہ دوسروں کو موقع ہی نہیں دیتے۔ ہائی کمانڈ کوشش کر رہا ہے کہ عورتوں کی تعداد میں کافی اضافہ کر دیا جائے، مگر جب تک

یہ انتظام نہیں ہوتا، بندوقچیوں کو ہدایت ...... کی جاتی ہے کہ زیادہ دیر تک اندر نہ رہا کریں اور اپنی خواہشات کی تسکین میں ذرا عجلت سے کام لیا کریں گے۔

غور تو کیجیے۔ یہ اعلان دنیا کی ایک مہذب ترین حکومت کے فوجی محکمہ کی طرف سے باضابطہ سرکاری طور پر شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زنا کے اخلاقاً معیوب ہونے کا وہم تک ان لوگوں کے دل و دماغ میں باقی نہیں رہا ہے۔ سوسائٹی، قانون، حکومت سب کے سب اس تصور سے خالی ہو چکے ہیں[۱]۔

جنگِ عظیم سے کچھ مدت پہلے فرانس میں ایک ایجنسی اس اصول پر قائم کی گئی تھی کہ ہر عورت خواہ وہ اپنے حالات، ماحول، مالی کیفیت اور رعادی اخلاقی چال چلن کے اعتبار سے کیسی ہی ہو، بہر حال "ایک نئے تجربہ" کے لیے آمادہ کی جا سکتی ہے۔ جو صاحب کسی خاتون سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہوں وہ بس اتنی زحمت اٹھائیں کہ ان لیڈی صاحبہ کا اتا پتا بتا دیں اور ۲۵ فرانک ابتدائی فیس کے طور پر داخل کر دیں۔ اس کے بعد صاحبہ موصوفہ کو معاملہ پر راضی کر لینا ایجنسی کا کام ہے۔ اس ایجنسی کے رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ فرنچ سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس کے کثیر التعداد لوگوں نے اس سے "بزنس" نہ کیا ہو، اور یہ کاروبار حکومت سے بھی مخفی نہ تھا۔ (بیورو۔ صفحہ ۱۶)

اس اخلاقی زوال کی انتہا یہ ہے کہ:

"فرانس کے بعض اضلاع میں اور بڑے شہروں کی گھنی آبادی رکھنے والے حصوں میں قریب ترین نسبی

---

[۱] جس فوج کی یہ اخلاقی حالت ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ کسی دوسرے ملک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہوگی تو اس کے ہاتھوں مغلوب قوم کی عزت و آبرو پر کیا کچھ نہ گزر جاتی ہوگی۔ سپاہیانہ اخلاق کا ایک معیار یہ ہے اور دوسرا معیار وہ ہے جو قرآن پیش کرتا ہے کہ الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ ایک وہ سپاہی ہے جو زمین میں سانڈ بنا پھرتا ہے۔ اور ایک سپاہی وہ ہے جو اس لیے سر ہتھیلی پر لیکر نکلتا ہے کہ انسانی اخلاق کی حفاظت کرے اور دنیا کو پاکیزگی کا سبق سکھائے۔ کیا انسان اتنا اندھا ہو گیا ہے کہ دونوں کا فرق نہیں دیکھ سکتا؟

رشتہ داروں کے درمیان، حتیٰ کہ باپ اور بیٹی اور بھائی اور بہن تک کے درمیان صنفی تعلقات کا پایا جانا،
اب کوئی شاذ و نادر واقعہ نہیں رہا ہے۔"

فواحش کی کثرت | جنگ عظیم سے چند سال پہلے موسیو بیولو (M. Bulot) فرانس کے اٹارنی جنرل نے اپنی رپورٹ میں اُن عورتوں کی تعداد ۵ لاکھ بتائی تھی جو اپنے جسم کو کرایہ پر چلاتی ہیں۔ مگر وہاں کی زنان بازاری کو ہندوستان کی پیشہ ور فاحشات پر قیاس نہ کر لیجیے۔ شائستہ اور متمدن ملک ہے۔ اسکے سب کام شائستگی، تنظیم اور فی الجملہ بلند پیمانے پر ہوتے ہیں۔ وہاں اس پیشہ میں فن اشتہار سے پورا کام لیا جاتا ہے۔ اخبار، مصور پوسٹ کارڈ، ٹیلیفون، اور شخصی دعوت نامے، غرض تمام مہذب طریقے گاہکوں کی توجہ منعطف کرانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اور پبلک کا ضمیر اس پر کوئی ملامت نہیں کرتا۔ بلکہ اس تجارت میں جن عورتوں کو زیادہ کامیابی نصیب ہو جاتی ہے وہ بسا اوقات ملکی سیاسیات اور سیاسیات میں اور اعیان و امراء کے طبقوں میں کافی با اقتدار ہو جاتی ہیں۔ وہی ترقی جو کبھی یونانی تمدن میں اس طبقہ کی عورتوں کو نصیب ہوئی تھی!

فرنچ سنیٹ کے ایک رکن موسیو فرد ناں دریفو (M. Ferdinand Dreyfus) نے اب سے چند سال پہلے بیان کیا تھا کہ قحبہ گری کا پیشہ اب محض ایک انفرادی کام نہیں رہا ہے، بلکہ اسکی ایجنسی سے جو عظیم مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں انکی وجہ سے اب یہ ایک تجارت (Business) اور ایک منظم حرفہ (Organised Industry) بن گیا ہے۔ اس کے "خام پیداوار" مہیا کرنے والے ایجنٹ الگ ہیں، سفری ایجنٹ الگ ہیں۔ اسکی باقاعدہ منڈیاں موجود ہیں۔ جوان لڑکیاں اور کمسن بچیاں وہ تجارتی مال ہیں جسکی درآمد اور برآمد ہوتی ہے، اور دس سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ ہے۔

پُول بیورو لکھتا ہے :۔

"یہ ایک زبردست نظام ہے جو پورے منضبط طریقے سے تنخواہ یاب عہدہ داروں اور کارکنوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ناشرین اور اہل قلم (Publicists) خطباء و مقررین، اطباء اور

قابلات (Midwives) اور تجارتی سیّاح اس میں باقاعدہ ملازم ہیں، اور اشتہار اور مظاہرہ کے جدید ترین طریقے اسکے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔"

فحش کاری کے ان اڈّوں کے ماسوا ہوٹلوں اور رقص خانوں اور رقص خانوں میں علی الاعلان قحبہ گری کا کاروبار ہو رہا ہے، اور بعض اوقات بہیمیت انتہائی ظلم اور قساوت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں ایک مرتبہ مشرقی فرانس کے ایک میر بلدیہ (Mayor) کو مداخلت کرکے ایک ایسی لڑکی کی جان بخشی کرانی پڑی تھی جسکو دن بھر میں ۲۷ گاہکوں سے پالا پڑ چکا تھا اور ابھی مزید گاہک تیار کھڑے تھے۔

تجارتی قحبہ خانوں کے علاوہ "خیراتی قحبہ خانوں" کی ایک نئی قسم پیدا کرنے کا شرف جنگ عظیم کو حاصل ہوا۔ جنگ کے زمانہ میں جن محب وطن خواتین نے سرزمین فرانس کی حفاظت کرنے والے بہادروں کی "خدمت" فرمائی تھی، اور جنکو اس خدمت کے صلہ میں بے باپ کے بچے مل گئے تھے، انہیں (War-godmothers) کا معزز لقب عطا ہوا ــــ یہ ایسا اچھوتا تخیل ہے کہ اردو زبان اسکا ترجمہ کرنے سے عاجز ہے ــــ یہ خواتین منظم صورت میں قحبہ گری کرنے لگیں اور انکی "امداد" کرنا سپاہ کاروں کے لیے ایک اخلاقی کام بن گیا۔ بڑے بڑے روزانہ اخباروں اور خصوصاً فرانس کے دو مشہور مصور جریدوں فنتاسیو (Fantasio) اور لاوی پاریزیاں (La Vie Parisienne) نے ان کی طرف "مردان کار" کی توجہ جلب کرانے کی خدمت سب سے بڑھکر انجام دی۔ ۱۹۱۵ء کے آغاز میں موخر الذکر اخبار کا صرف ایک نمبر ان عورتوں کے ۱۹۹ اشتہارات پر مشتمل تھا۔

شہوانیت اور بے حیائی کی وبا فواحش کی یہ کثرت اور مقبولیت شہوانی جذبات کے جس اشتعال کا نتیجہ ہے وہ لٹریچر، تصاویر، سینما، تھیٹر، رقص، اور برہنگی و بے حیائی کے عام مظاہروں سے رونما ہوتا ہے۔ خود غرض سرمایہ داروں کا ایک پورا لشکر ہے جو ہر ممکن تدبیر سے عوام کی شہوانی پیاس کو بھڑکانے میں لگا ہوا ہے اور اس ذریعہ سے اپنے کاروبار کو فروغ دے رہا ہے۔ روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات،

مصور جرائد ما اور نصف ماہی اور ماہوار رسالے انتہا درجہ کے فحش مضامین اور شرمناک تصویریں شائع کرتے ہیں کیونکہ اشاعت بڑھانے کا یہ سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے، اور اس کام میں اعلیٰ درجہ کی ذہانت، فن کاری، اور نفسیات کی مہارت صرف کی جاتی ہے تاکہ شکار کسی طرف سے بچ کر نہ جا سکے۔ ان کے علاوہ صنفی مسائل پر حادرجہ ناپاک لٹریچر پمفلٹوں اور کتابوں کی شکل میں نکلتا رہتا ہے، جنکی کثرت اشاعت کا یہ حال ہے کہ ایک ایک ایڈیشن پچاس پچاس ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے اور بسا اوقات ساٹھ ساٹھ ایڈیشنوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ بعض اشاعت خانے تو صرف اسی لٹریچر کی اشاعت کے لیے مخصوص ہیں۔ بہت سے اہلِ قلم ایسے ہیں جو اسی ذریعہ سے شہرت اور عزت کے مرتبے پر پہنچے ہیں۔ اب کسی فحش کتاب کا لکھنا کسی کے لیے بے عزتی نہیں ہے، بلکہ اگر کتاب مقبول ہو جائے تو ایسے مصنفین فرینچ اکیڈمی کے ممبر یا کم از کم "کروے دانیور" (Croix dihonneur) کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

حکومت اِن تمام بے شرمیوں اور ہیجان انگیزیوں کو ٹھنڈے دل سے دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی بہت ہی زیادہ شرمناک چیز شائع ہو گئی تو پولیس نے بادلِ ناخواستہ چالان کر دیا۔ مگر اوپر فراخ دل عدالتیں بیٹھی ہیں جنکی بارگاہ عدل سے اس قسم کے مجرموں کو صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ عدالت کی کرسئ شدن پر جلوہ فرما ہوتے ہیں ان میں سے اکثر خود اس لٹریچر سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں، اور بعض حکام عدالت کا اپنا قلم فحش صنفی لٹریچر کی تصنیف سے آلودہ ہوتا ہے۔ اتفاقاً اگر کوئی مجسٹریٹ دقیانوسی خیال کا نکل آیا اور اس سے "بے انصافی" کا اندیشہ ہوا تو بڑے بڑے ادیب اور نامور اہلِ قلم بالاتفاق اس معاملہ میں مداخلت کرتے ہیں، اور زور شور سے اخبارات میں لکھا جاتا ہے کہ آرٹ اور لٹریچر کی ترقی کے لیے آزاد فضا درکار ہے، قرونِ مظلمہ کی سی ذہنیت کے ساتھ اخلاقی بندشیں لگانے کے معنی تو یہ ہیں کہ فنونِ لطیفہ کا گلا گھونٹ دیا جائے!

اور یہ فنونِ لطیفہ کی ترقی ہوتی کس کس طرح ہے؟ اس میں ایک بڑا حصہ اُن ننگی تصویروں اور

"عملی تصویروں" کا ہے جنکے البم لاکھوں کی تعداد میں تیار کیے جاتے ہیں اور نہ صرف بازاروں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں، بلکہ مدرسوں اور کالجوں تک میں پھیلائے جاتے ہیں۔ امیل پورسیی (Emile Pourcisy) نے "جمعیت انسداد فواحش" کے دوسرے اجلاس عام میں جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں وہ لکھتا ہے:۔

"یہ گندے فوٹوگراف لوگوں کے حواس میں شدید ہیجان و اختلال برپا کرتے ہیں اور اپنے بدقسمت خریداروں کو ایسے ایسے جرائم پر اکساتے ہیں جنکے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں پر ان کا تباہ کن اثر حدِ بیان سے زیادہ ہے۔ بہت سے مدرسے اور کالج انہی کی بدولت اخلاقی اور جسمانی حیثیت سے برباد ہو چکے ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے لیے تو کوئی چیز اس سے زیادہ غارتگر نہیں ہو سکتی۔"

اور انہی فنون لطیفہ کی خدمت تھیٹر، سینما، میوزک ہال اور قہوہ خانوں کی تفریحات کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔ وہ ڈرامے جنکی تمثیل کو فرنچ سوسائیٹی کے اونچے سے اونچے طبقے دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں اور جنکے مصنفین اور کامیاب نقالوں پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کیے جاتے ہیں، بلا استثناء سب کے سب شہوانیت اور بے قیدی بے لگام شہوانیت سے لبریز ہیں، اور ان کی نمایاں خصوصیت بس یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے جو کیرکٹر بدترین ہو سکتا ہے اُسکو اُن میں مثلِ اعلیٰ اور اسوۂ حسنہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ پول بیورو کے بقول "تیس چالیس سال سے ہمارے ڈرامانگار زندگی کے جو نقشے پیش کر رہے ہیں انکو دیکھ کر اگر کوئی شخص ہماری تمدنی زندگی کا اندازہ لگانا چاہے تو وہ بس یہ سمجھے گا کہ ہماری سوسائیٹی میں جتنے شادی شدہ جوڑے ہیں سب خائن اور ازدواجی وفاداری سے عاری ہیں، شوہر یا بیوقوف ہوتا ہے یا بیوی کے لیے بلائے جان، اور بیوی کی بہترین صفت اگر کوئی ہے تو وہ یہ کہ ہر وقت شوہر سے دل برداشتہ ہونے اور اِدھر اُدھر دل لگانے کے لیے تیار رہے۔"

اونچی سوسائیٹی کے تھیٹروں کا جب یہ حال ہے تو عوام کے تھیٹروں اور تفریح گاہوں کا جو کچھ رنگ، ہوگا اس کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ بدترین آوارہ منش لوگ جس زبان، جن اداؤں، اور جن عریانیوں سے مطمئن ہو سکتے ہیں وہ بغیر کسی شرم و حیا اور رلاگ لپیٹ کے وہاں پیش کر دی جاتی ہیں، اور عوام کو اشتہارات کے ذریعہ سے یقین دلایا جاتا ہے کہ تمہاری شہوانی پیاس جو جو کچھ مانگتی ہے وہ سب یہاں حاضر ہے "ہمارا اسٹیج تکلف سے خالی اور حقیقت پر مبنی (Realistic) ہے"۔ امیل پوریسی نے اپنی رپورٹ میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو مختلف تفریح گاہوں میں گشت لگا کر جمع کی گئی تھیں۔ ناموں کو اس نے حروف تہجی کے پردے میں چھپا دیا ہے:۔

"ب میں ایکٹریس کے گیت، تکلمات (Monologues) اور حرکات انتہا درجے کے فحش تھے، اور پردوں پر جو پس منظر پیش کیا گیا تھا وہ بس صنفی اختلاط کے آخری مدارج تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ ایک ہزار سے زیادہ تماشائی موجود تھے، جن میں شرفا بھی نظر آتے تھے، اور سب عالم بے خودی میں صدائے آفرین و مرحبا بلند کر رہے تھے۔

"ن میں چھوٹے چھوٹے گیت، اور انکے درمیان مختصر تکلمات، اور انکے ساتھ حرکات و سکنات، بے شرمی کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، بچے اور کمسن نوجوان اپنے والدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس تماشہ کو دیکھ رہے تھے اور پر جوش طریقے سے ہر شدید بے شرمی پر تالیاں بجاتے تھے۔

"ل میں حاضرین کے ہجوم نے پانچ مرتبہ شور مچا کر ایک ایسی ایکٹریس کو اعادہ پر مجبور کیا جو اپنے ایکٹ کو ایک حد درجہ فحش گیت پر ختم کرتی تھی۔

"س میں حاضرین نے ایک ایکٹریس سے بار بار فرمائش کر کے ایک نہایت فحش چیز کا اعادہ کرایا، آخر اس نے بگڑ کر کہا "تم کتنے بے شرم لوگ ہو، دیکھتے نہیں ہو کہ ہال میں بچے بھی موجود ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ ایکٹ پورا کیے بغیر ہٹ گئی۔ چیز اتنی فحش تھی کہ وہ عادی مجرمہ بھی اسکی تکرار کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔

"نسا میں تماشا ختم ہونے کے بعد ایکٹرسوں پر لاٹری ڈالی گئی۔ لاٹری کے ٹکٹ خود ایکٹرسیں دس دس سانتیم[1] میں فروخت کر رہی تھیں۔ جس شخص کے نام جو ایکٹرس نکل آئی وہ اس رات کے لیے اسکی تھی۔"

پول بیورو لکھتا ہے کہ بسا اوقات اسٹیج پر بالکل برہنہ عورتیں تک پیش کر دی جاتی ہیں جنکے جسم پر کپڑے کے نام کا ایک تار بھی نہیں ہوتا۔ اودلف بریساں (Adolphe Brisson) نے ایک مرتبہ فرانس کے مشہور اخبار "طان" (Temps) میں ان چیزوں پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اب بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ اسٹیج پر فعل مباشرت کا منظر پیش کر دیا جائے" اور سچ یہ ہے کہ "آرٹ" کی تکمیل تب ہی ہوگی!

منع حمل کی تحریک اور صنفیات (Sexual Science) کے نام نہاد علمی اور طبی لٹریچر نے بھی بے حیائی پھیلانے اور لوگوں کے اخلاق بگاڑنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ پبلک جلسوں میں تقریروں اور میجک لینٹرن کے ذریعہ سے، اور مطبوعات میں تصاویر اور تشریحی بیانات کے ذریعہ سے حمل اور اسکے متعلقات اور مانع حمل آلات کے طریق استعمال کی وہ وہ تفصیلات بیان کی جاتی ہیں جنکے بعد کوئی چیز قابلِ اظہار باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح صنفیات کی کتابوں میں تشریح بدن سے لیکر ـــــ آخر تک معاملات صنفی کے کسی پہلو کو بھی روشنی میں لائے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ بظاہر ان سب چیزوں پر علم اور سائنس کا غلاف چڑھا دیا گیا ہے تاکہ یہ اعتراض سے بالاتر ہو جائیں۔ بلکہ مزید ترقی کر کے ان چیزوں کی اشاعت کو "خدمتِ خلق" کے نام سے بھی موسوم کر دیا جاتا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہم تو لوگوں کو صنفی معاملات میں غلطیاں کرنے سے بچانا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس لٹریچر اور اس تعلیم کی عام اشاعت نے عورتوں، مردوں، اور کمسن نوجوانوں میں سخت بے حیائی پیدا کر دی ہے۔ اسکی بدولت آج یہ نوبت آگئی ہے کہ ایک نوخیز لڑکی جو مدرسے میں تعلیم پاتی ہے اور ابھی سن بلوغ کو بھی پوری طرح نہیں پہنچی ہے، صنفی معاملات کے متعلق وہ معلومات رکھتی ہے جو کبھی شادی شدہ عورتوں کو بھی حاصل نہ تھیں۔ اور یہی حال نوخیز بلکہ نابالغ لڑکوں کا بھی ہے۔ ان کے جذبات قبل از وقت بیدار ہو

[1] تقریباً دو آنے۔

جاتے ہیں۔ ان میں صنفی تجربات کا شوق پیدا ہو جاتا ہے پوری جوانی کو پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے آپ کو خواہشاتِ نفسانی کے چنگل میں دے دیتے ہیں۔ نکاح کے لیے تو عمر کی حد مقرر کی گئی ہے، مگر ان تجربات کے لیے کوئی حد مقرر نہیں۔ بارہ تیرہ سال کی عمر ہی سے انکا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

قومی ہلاکت کے آثار جہاں بداخلاقی، نفس پرستی اور لذات جسمانی کی بندگی اس حد کو پہنچ چکی ہو، جہاں عورت، مرد، جوان، بوڑھے اسب کے سب عیش کوشی میں اس قدر منہمک ہو گئے ہوں، اور جہاں انسان کو شہوانیت کے انتہائی اشتعال نے یوں آپے سے باہر کر دیا ہو، ایسی جگہ اُن تمام اسباب کا بروئے کار آجانا بالکل ایک طبعی امر ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے موجب ہوتے ہیں۔ لوگ اس قسم کی بر سر انحطاط، علیٰ شفا حفرۃ من النار قوموں کو بر سر عروج دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ انکی عیش پرستی انکی ترقی میں مانع نہیں ہے بلکہ الٹی مددگار رہے، اور یہ کہ ایک قوم کے انتہائی عروج و ترقی کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب وہ لذت پرستی کے انتہائی مرتبہ پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک سراسر غلط استنتاج ہے۔ جہاں تعمیر اور تخریب کی قوتیں ملی جلی کام کر رہی ہوں، اور مجموعی حیثیت سے تعمیر کا پہلو نمایاں نظر آتا ہو، وہاں تخریبی قوتوں کو بھی اسباب تعمیر میں شمار کر لینا صرف اس شخص کا کام ہو سکتا ہے جسکی عقل خبط ہو گئی ہو۔

مثال کے طور پر اگر ایک ہوشیار تاجر اپنی ذہانت، محنت، اور آزمودہ کاری کے سبب سے لاکھوں روپیہ کما رہا ہے، اور اسکے ساتھ وہ مے نوشی، قمار بازی اور عیاشی میں بھی مبتلا ہو گیا ہے، تو آپ کتنی بڑی غلطی کرینگے اگر اسکی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو اسکی خوشحالی و ترقی کے اسباب میں شمار کر لینگے۔ دراصل اسکی صفات کا پہلا مجموعہ اسکی تعمیر کا موجب ہے، اور دوسرا مجموعہ اس عمارت کی تخریب میں لگا ہوا ہے۔ پہلے مجموعہ کی طاقت سے اگر عمارت قائم ہے تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ دوسرے مجموعہ کی تخریبی طاقت اپنا اثر نہیں کر رہی ہے۔ ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو پتہ چلیگا کہ یہ تخریبی قوتیں اسکے دماغ اور جسم کی طاقتوں کو برابر کھائے جا رہی ہیں، اسکی محنت سے کمائی ہوئی دولت پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں، اور اسکو بتدریج تباہ کرنے

کے ساتھ ساتھ ہر وقت اس تاک میں لگی ہوئی ہیں کہ کب ایک فیصلہ کن حملہ کا موقع ملے اور یہ ایک ہی وار میں اس کا خاتمہ کر دیں۔ قمار بازی کا شیطان کسی بری گھڑی میں اسکی عمر بھر کی کمائی کو ایک سکنڈ میں غارت کر سکتا ہے اور وہ اس گھڑی کا منتظر بیٹھا ہے۔ مے نوشی کا شیطان وقت آنے پر اس سے عالم مدہوشی میں ایسی غلطی کرا سکتا ہے جو یکلخت اسے دیوالیہ بنا کر چھوڑ دے، اور وہ بھی گھات میں لگا ہوا ہے۔ بدکاری کا شیطان بھی اُس گھڑی کا انتظار کر رہا ہے جب وہ اسے قتل یا خودکشی یا کسی اور اچانک تباہی میں مبتلا کر دے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اگر وہ ان شیاطین کے چنگل میں پھنسا ہوا نہ ہوتا تو اسکی ترقی کا کیا حال ہوتا۔

ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ تعمیری قوتوں کے بل پر ترقی کرتی ہے، مگر صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے ترقی کی طرف چند ہی قدم بڑھانیکے بعد خود اپنی تخریب کے اسباب فراہم کرنے لگتی ہے۔ کچھ مدت تک تعمیری قوتیں اپنے زور میں اسے آگے بڑھائے لیے چلی جاتی ہیں، مگر اسکے ساتھ ساتھ تخریبی قوتیں اس کی زندگی کی طاقت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہتی ہیں یہاں تک کہ آخرکار اسے اتنا کھوکھلا کر کے رکھدیتی ہیں کہ ایک اچانک صدمہ اسکے قصرِ عظمت کو آن کی آن میں پیوندِ خاک کر سکتا ہے۔ یہاں مختصر طور پر ہم اُن بڑے بڑے نمایاں اسباب ہلاکت کو بیان کرینگے جو فرنچ قوم کے اس غلط نظام معاشرت نے اسکے لیے پیدا کیے ہیں۔

جسمانی قوتوں کا انحطاط شہوانیت کے اس تسلط کا اولین نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فرانسیسیوں کی جسمانی قوت رفتہ رفتہ جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ دائمی ہیجانات نے انکے اعصاب کمزور کر دیے ہیں۔ خواہشات کی بندگی نے ان میں ضبط اور برداشت کی طاقت کم ہی باقی چھوڑی ہے۔ اور امراض خبیثہ کی کثرت نے انکی صحت پر نہایت مہلک اثر ڈالا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے یہ کیفیت ہے کہ فرانس کے فوجی حکام کو مجبوراً ہر چند سال کے بعد نئے رنگروٹوں کے لیے جسمانی اہلیت کے معیار کو گھٹا دینا پڑتا ہے، کیونکہ اہلیت کا جو معیار پہلے تھا اب اس معیار کے نوجوان قوم میں کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک معتبر پیمانہ ہے جو تقریباً میٹر کی

طرح قریب قریب یقینی صحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ فرنچ قوم کی جسمانی قوتیں کتنی تیزی کے ساتھ بتدریج گھٹ رہی ہیں۔ امراض خبیثہ اس تنزل کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہیں۔ جنگ عظیم کے ابتدائی دو سالوں میں جن سپاہیوں کو محض آتشک کی وجہ سے رخصت دیکر ہسپتالوں میں بھیجنا پڑا انکی تعداد ۷۵۰۰۰ تھی صرف ایک متوسط درجہ کی فوجی چھاؤنی میں بیک وقت ۲۴۲ سپاہی اس مرض میں مبتلا ہوئے۔ ایک طرف اس وقت کی نزاکت کو دیکھیے کہ فرانسیسی قوم کی موت اور حیات کا فیصلہ درپیش تھا اور اسکے وجود و بقا کے لیے ایک ایک سپاہی کی جانفشانی درکار تھی، ایک ایک فرانک بیش قیمت تھا، اور وقت، قوت، وسائل، ہر چیز کی زیادہ سے زیادہ مقدار دفاع میں خرچ ہونے کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف اس قوم کے نوجوانوں کو دیکھیے کہ کتنے ہزار افراد اس عیاشی کی بدولت نہ صرف خود کئی کئی مہینوں کے لیے بیکار رہے بلکہ انہوں نے اپنی قوم کی دولت اور وسائل کو بھی اس اڑے وقت میں اپنے علاج پر ضائع کرایا۔

ایک فرانسیسی ماہر فن ڈاکٹر لیریڈ (Dr. Leredde) کا بیان ہے کہ فرانس میں ہر سال صرف آتشک اور اسکے پیدا کردہ امراض کی وجہ سے ۳۰ ہزار جانیں ضائع ہوتی ہیں اور دق کے بعد یہ مرض سب سے زیادہ ہلاکتوں کا باعث ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک مرض خبیث کا حال ہے، اور امراض خبیثہ کی فہرست صرف اسی ایک مرض پر مشتمل نہیں ہے۔

خاندانی نظام کی بربادی اس بے قید شہوانیت، اور آوارہ منشی کے اس رواج عام نے دوسری عظیم الشان مصیبت جو فرانسیسی تمدن پر نازل کی ہے وہ خاندانی نظام کی تباہی ہے۔ خاندان کا نظام عورت اور مرد کے اس مستقل اور پائیدار تعلق سے بنتا ہے جس کا نام نکاح ہے۔ اسی تعلق کی بدولت افراد کی زندگی میں سکون، استقلال اور ثبات پیدا ہوتا ہے۔ یہی چیز انکی انفرادیت کو اجتماعیت میں تبدیل کرتی ہے اور انتشار (انارکی) کے میلانات کو دبا کر انہیں تمدن کا خادم بناتی ہے۔ اسی نظام کے دائرے میں محبت اور راستی اور ایثار کی وہ پاکیزہ فضا پیدا ہوتی ہے جس میں نئی نسلیں صحیح اخلاق، صحیح تربیت اور صحیح قسم کی تعمیر سیرت

کے ساتھ پروان چڑھ سکتی ہیں۔ لیکن جہاں عورتوں اور مردوں کے ذہن سے نکاح اور اسکے مقصد کا تصور
بالکل ہی نکل گیا ہو، اور جہاں صنفی تعلق کا کوئی مقصد شہوانی آگ کو بجھا لینے کے سوا لوگوں کے ذہن میں نہ ہو،
اور جہاں ذواقین و ذواقات کے لشکر کے لشکر بھنوروں کی طرح پھول پھول کا رس لیتے پھرتے ہوں،
وہاں یہ نظام نہ قائم ہو سکتا ہے نہ قائم رہ سکتا ہے۔ وہاں عورتوں اور مردوں میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں
رہتی کہ ازدواج کی ذمہ داریوں اور اسکے حقوق و فرائض، اور اسکے اخلاقی انضباط کا بوجھ سہار سکیں۔ اور
انکی اس ذہنی و اخلاقی کیفیت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہر نسل کی تربیت پہلی نسل سے بدتر ہوتی ہے۔ افراد میں
خود غرضی و خودسری اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ تمدن کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ نفوس میں تلون اور سیماب وشی
اتنی بڑھ جاتی ہے کہ قومی سیاست اور اسکے بین الاقوامی رویّہ میں بھی کوئی ٹھیراؤ باقی نہیں رہتا۔ گھر کا سکون بہم نہ
پہنچنے کی وجہ سے افراد کی زندگیاں تلخ اور تلخ تر ہوتی جاتی ہیں اور ایک دائمی اضطراب انکو کسی کل چین نہیں
لینے دیتا۔ یہ دنیوی جہنم کا عذاب ہے، جسے انسان اپنی احمقانہ لذت طلبی کے جنون میں خود مول لیتا ہے۔

فرانس میں سالانہ سات آٹھ فی ہزار کا اوسط ان مردوں اور عورتوں کا ہے جو ازدواج کے رشتہ
میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ اوسط خود اتنا کم ہے کہ اسے دیکھ کر آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آبادی کا
کتنا کثیر حصہ غیر شادی شدہ ہے۔ پھر اتنی قلیل تعداد جو نکاح کرتی ہے ان میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں
جو باعصمت رہنے اور پاک اخلاقی زندگی بسر کرنے کی نیت سے نکاح کرتے ہیں۔ اس ایک مقصد کے
سوا ہر دوسرا ممکن مقصد انکے پیش نظر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ عامۃ الورود مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نکاح
سے پہلے ایک عورت نے جو بچہ ناجائز طور پر جنا ہے، نکاح کر کے اسکو مولود جائز بنا دیا جائے۔ چنانچہ پول بیورو
لکھتا ہے کہ فرانس کے کام پیشہ لوگوں (Working Classes) میں یہ عام دستور ہے کہ
نکاح سے پہلے عورت اپنے ہونے والے شوہر سے اس بات کا وعدہ لے لیتی ہے کہ وہ اسکے بچہ کو اپنا
بچہ تسلیم کریگا۔ ۱۹۱۷ء میں سین (Seine) کی عدالتِ دیوانی کے سامنے ایک عورت نے

بیان دیا کہ "میں نے شادی کے وقت ہی اپنے شوہر کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ اس شادی سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے قبل از نکاح آزادانہ تعلق سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں انکو "حلالی" بنا دیا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں اسکے ساتھ بیوی بنکر زندگی گذاروں، تو یہ نہ اس وقت میرے ذہن میں تھی نہ اب ہے۔ اسی بنا پر جس روز شادی ہوئی ...... اسی روز ساڑھے پانچ بجے میں اپنے شوہر سے الگ ہوگئی اور آج تک اس سے نہیں ملی کیونکہ میں فرائض زوجیت ادا کرنے کی کوئی نیت نہ رکھتی تھی۔" (صفحہ ۵۵)

پیرس کے ایک مشہور کالج کے پرنسپل نے پول بیورو سے بیان کیا کہ "عموماً نوجوان نکاح میں صرف یہ مقصد پیش نظر رکھتے ہیں کہ گھر پر بھی ایک داشتہ کی خدمات حاصل کرلیں۔ دس بارہ سال تک وہ ہر طرف آزادانہ مزے چکھتے پھرتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ اس قسم کی بے ضابطہ آوارہ زندگی سے تھک کر وہ ایک عورت سے شادی کرلیتے ہیں تاکہ گھر کی آسائش بھی کسی حد تک بہم پہنچے اور آزادانہ ذوّاقی کا لطف بھی حاصل کیا جاتا رہے۔" (صفحہ ۵۶)

فرانس میں شادی شدہ اشخاص کا زناکار ہونا قطعاً کوئی معیوب یا قابلِ ملامت فعل نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے علاوہ کوئی مستقل داشتہ رکھتا ہو تو وہ اسے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا، اور سوسائٹی اس فعل کو بالکل ایک معمولی اور متوقع بات سمجھتی ہے (صفحہ ۷۶-۷۷)

ان حالات میں نکاح کا رشتہ اس قدر بودا ہو کر رہ گیا ہے کہ بات بات میں ٹوٹ جاتا ہے بسا اوقات اس بیچارے کی عمر چند گھنٹوں سے متجاوز نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرانس کے ایک ایسے معزز شخص نے جو کئی مرتبہ وزیر رہ چکا تھا، اپنی شادی کے صرف پانچ گھنٹہ بعد اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرلی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں طلاق کی موجب بن جاتی ہیں جنہیں سن کر ہنسی آتی ہے۔ مثلاً فریقین میں سے کسی ایک کا سوتے میں خرّانٹے لینا، یا کتّے کو پسند نہ کرنا! اسپین کی عدالت دیوانی نے ایک مرتبہ صرف

ایک تاریخ میں ۲۹۴ نکاح فسخ کیے ۱۸۸۴ء میں جب طلاق کا نیا قانون پاس ہوا تھا، چار ہزار طلاق واقع ہوئے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں یہ تعداد ساڑھے سات ہزار تک پہنچی۔ ۱۹۱۳ء میں ۱۶ ہزار۔ اور ۱۹۳۱ء میں ۲۱ ہزار۔

نسل کُشی | بچوں کی پرورش ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی کام ہے جو ضبطِ نفس، خواہشات کی قربانی، تکلیفوں اور محنتوں کی برداشت اور جان و مال کا ایثار چاہتا ہے۔ خود غرض، نفس پرست لوگ جن پر انفرادیت اور بہیمیت کا پورا پورا تسلط ہو چکا ہو، اس خدمت کی انجام دہی کے لیے کسی طرح راضی نہیں ہو سکتے۔ ساٹھ ستر برس سے فرانس میں منع حمل کی تحریک کا زبردست پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ اس تحریک کی بدولت سرزمین فرانس کے ایک ایک مرد اور ایک ایک عورت تک ان تدابیر کا علم پہنچا دیا گیا ہے جن سے آدمی اس قابل ہو سکتا ہے کہ صنفی تعلق اور اسکی لذات سے متمتع ہونے کے باوجود اس فعل کے قدرتی نتیجہ، یعنی استقرار حمل اور تولید نسل سے بچ سکے۔ کوئی شہر، قصبہ یا گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں مانع حمل دوائیں اور آلات برسرعام فروخت نہ ہوتے ہوں اور ہر شخص انکو حاصل نہ کر سکتا ہو۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ آزاد شہوت رانی کرنے والے لوگ ہی نہیں، بلکہ شادی شدہ جوڑے بھی کثرت سے ان تدبیروں کو استعمال کرتے ہیں، اور ہر زن و مرد کی یہ خواہش ہے کہ ان کے درمیان بچہ، یعنی وہ بلا جو تمام لطف و لذت کو کرکرا کر دیتی ہے، کسی طرح خلل انداز نہ ہونے پائے۔ فرانس کی شرح پیدائش جس رفتار سے گھٹ رہی ہے اسکو دیکھ ماہرین فن نے اندازہ لگایا ہے کہ منع حمل کی اس وبائے عام کی بدولت کم از کم ۶ لاکھ انسانوں کی پیدائش ہر سال روک دی جاتی ہے۔

ان تدابیر کے باوجود جو حمل ٹھہر جاتے ہیں انکو اسقاط کے ذریعہ سے ضائع کیا جاتا ہے، اور اس طرح مزید تین چار لاکھ انسان دنیا میں آنے سے روک دیے جاتے ہیں۔ اسقاط حمل صرف غیر شادی عورتیں ہی نہیں کراتیں بلکہ شادی شدہ بھی اس معاملہ میں انکی ہم پلہ ہیں۔ اخلاقاً اس فعل کو

ناقابلِ اعتراض، بلکہ عورت کا حق سمجھا جاتا ہے - قانون نے اسکی طرف سے گویا آنکھیں بند کرلی ہیں اگرچہ کتاب آئین میں یہ فعل ابھی تک جرم ہے، لیکن عملاً یہ حال ہے کہ ۳۰۰ میں سے بمشکل ایک کے چالان کی نوبت آتی ہے، اور پھر جن کا چالان ہوتا ہے اُن میں سے بھی ۵، فی صدی عدالت میں جاکر چھوٹ جاتے ہیں - اسقاط کی طبی تدابیر اتنی آسان اور اس قدر معلوم عوام کردی گئی ہیں کہ اکثر عورتیں خود ہی اسقاط کرلیتی ہیں - اور جو نہیں کرسکتیں انہیں طبی امداد حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی - پیٹ کے بچے کو ہلاک کردینا ان لوگوں کے لیے بالکل ایسا ہو گیا ہے جیسے کسی درد کرتے والے دانت کو نکلوا دینا!

اس ذہنیت نے فطرت مادری کو اتنا مسخ کردیا ہے کہ وہ ماں جس کی محبت کو دنیا ہمیشہ سے محبت کا بلند ترین منتہی سمجھتی رہی ہے، آج اپنی اولاد سے بیزار، متنفر، بلکہ اسکی دشمن ہو گئی ہے - منع حمل اور اسقاط سے بچ بچا کر بھی جو بچے دنیا میں آجاتے ہیں انکے ساتھ بھی سخت بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے اس دردناک حقیقت کو پول بیورو نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "آئے دن اخبارات میں اُن بچوں کے مصائب کی اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں جن پر ان کے ماں باپ سخت سے سخت ظلم ڈھاتے ہیں - اخباروں میں تو صرف غیر معمولی واقعات ہی کا تذکرہ آتا ہے - مگر لوگ واقف ہیں کہ عموماً ان بچوں —— ناخواندہ مہمانوں —— کے ساتھ کیسا بے رحمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے جن سے انکے والدین صرف اسلیے دل برداشتہ ہیں کہ ان کمبختوں نے آکر زندگی کا سارا لطف غارت کردیا - جرأت کی کمی اسقاط میں مانع ہو جاتی ہے اور اس طرح ان معصوموں کو آنے کا موقع مل جاتا ہے، مگر جب یہ آجاتے ہیں تو انہیں اس کی پوری سزا بھگتنی پڑتی ہے"۔ (صفحہ ۷۴)

یہ بیزاری اور نفرت یہاں تک پہنچی ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت کا چھ مہینہ کا بچہ مرگیا تو وہ اسکی لاش

کو سامنے رکھ کر خوشی کے مارے ناچی اور گائی، اور اپنے ہمسایوں سے کہتی پھری کہ "اب ہم دوسرا بچہ نہ ہونے دینگے۔ مجھے اور میرے شوہر کو اس بچے کی موت سے بڑا اطمینان حاصل ہوا۔ دیکھو تو سہی ایک بچہ کیا چیز ہوتا ہے۔ ہر وقت روں روں کرتا رہتا ہے، گندگی پھیلاتا ہے، اور آدمی کو کبھی اس سے نجات نصیب نہیں ہوتی" (صفحہ ۰۷)

اس سے بھی زیادہ دردناک بات یہ ہے کہ بچوں کو قتل کرنے کی وبا تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور فرانسیسی حکومت اور اسکی عدالتیں استقاط حمل کی طرح اس جرم عظیم کے معاملہ میں بھی کمال درجہ کا تغافل برت رہی ہیں۔ مثلاً فروری ۱۹۱۸ء میں لوار (Loire) کی عدالت کے سامنے دو لڑکیاں اپنے بچوں کے قتل کے الزام میں پیش ہوئیں اور دونوں بری کردی گئیں۔ ان میں سے ایک لڑکی نے اپنے بچے کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا تھا۔ اسکے ایک بچے کو اسکے رشتہ دار پہلے سے پرورش کر رہے تھے اور اس دوسرے بچے کو بھی وہ پرورش کرنے کے لیے آمادہ تھے، مگر اس نے پھر بھی یہی فیصلہ کیا کہ اس غریب کو جیتا نہ چھوڑے۔ عدالت کی رائے میں اسکا جرم قابلِ معافی تھا۔ دوسری لڑکی نے اپنے بچے کو گلا گھونٹ کر مارا اور جب گلا گھونٹنے پر بھی اس میں کچھ جان باقی رہ گئی تو دیوار پر مار کر اسکا سر پھوڑ دیا۔ یہ عورت بھی فرانسیسی ججوں اور جیوری کی نگاہ میں جرم قتل کی سزاوار نہ ٹھیری۔ اسی سنہ کے ماہ مارچ میں سین کی عدالت کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوئی جس نے اپنے بچے کی زبان حلق سے کھینچنے کی کوشش کی، پھر اسکا سر پھوڑا اور آخر میں اسکا گلا کاٹ ڈالا۔ یہ عورت بھی جج اور جیوری، کسی کی رائے میں مجرمہ نہ تھی۔

جو قوم اپنی نسل کی دشمنی میں اس حد کو پہنچ جائے اسے دنیا کی کوئی تدبیر فنا ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ نئی نسلوں کی پیدائش ایک قوم کے وجود کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی نسل کی دشمن ہے تو دراصل وہ آپ اپنی دشمن ہے، خودکشی کر رہی ہے، کوئی بیرونی دشمن

نہ ہو تب بھی وہ آپ ہی اپنی ہستی کو مٹا دینے کے لیے کافی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں فرانس کی شرح پیدائش گذشتہ ۶۰ سال سے پیہم گرتی جا رہی ہے۔ کسی سال شرح اموات شرح پیدائش سے بڑھ جاتی ہے، کسی سال دونوں تقریباً برابر رہتی ہیں، اور کبھی شرح پیدائش، شرح اموات کی بہ نسبت مشکل سے ایک فی ہزار زائد ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرزمین فرانس میں غیر قوموں کے مہاجرین کی تعداد روزافزوں ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں فرانس کی ۴ کروڑ ۱۰ لاکھ آبادی میں ۲۸ لاکھ ۹۰ ہزار غیر قوموں کے لوگ تھے۔ یہ صورت حال یونہی جاری رہی تو بیسویں صدی کے اختتام تک فرانسیسی قوم عجب نہیں کہ خود اپنے وطن میں اقلیت بنکر رہ جائے۔

یہ انجام ہے اُن نظریات کا جن کی بنا پر عورتوں کی آزادی اور حقوق نسواں کی تحریک انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھائی گئی تھی۔

چند اور مثالیں

ہم نے محض تاریخی بیان کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے فرانس کے نظریات اور فرانس ہی کے نتائج بیان کیے ہیں۔ لیکن یہ گمان کرنا صحیح نہ ہوگا کہ فرانس اس معاملہ میں منفرد ہے۔ فی الحقیقت آج ان تمام ممالک کی کم و بیش یہی کیفیت ہے جنہوں نے وہ اخلاقی نظریات، اور معاشرت کے وہ غیر متوازن اصول اختیار کیے ہیں جنکا ذکر پچھلے ابواب میں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ممالک متحدۂ امریکہ کو لیجیے جہاں یہ نظامِ معاشرت اسوقت اپنے پورے شباب پر ہے۔

بچوں پر شہوانی ماحول کے اثرات جج بن لنڈسے (Ben Lindsey) جسکو ڈنور (Denver) کی عدالت جرائم اطفال (Juvenile court) کا صدر ہونے کی حیثیت سے امریکہ کے نوجوانوں کی اخلاقی حالت سے واقف ہونے کا بہت زیادہ موقع ملا ہے، اپنی کتاب (Revolt of Modern Youth) میں لکھتا ہے کہ امریکہ میں بچے قبل از وقت بالغ ہونے لگے ہیں اور بہت کچی عمر میں ان کے اندر صنفی احساسات بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس نے نمونہ کے طور پر ۳۱۲ لڑکیوں کے حالات کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے (۲۶۵) ایسی تھیں جو گیارہ اور تیرہ برس کے درمیان عمر میں بالغ ہو چکی تھیں اور ان کے اندر ایسی صنفی خواہشات اور ایسے جسمانی مطالبات کے آثار پائے جاتے تھے جو ایک ۱۸ برس اور اس سے بھی زیادہ عمر کی لڑکی میں ہونے چاہئیں۔[1]

ڈاکٹر ایڈتھ ہوکر (Edith Hooker) اپنی کتاب (Laws of Sex) میں لکھتا ہے کہ

---

[1] صفحہ ۸۲ تا ۸۶

"نہایت مہذب اور دولتمند طبقوں میں بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ سات آٹھ برس کی لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں سے عشق و محبت کے تعلقات رکھتی ہیں، اجنکے ساتھ بسا اوقات مباشرت بھی ہو جاتی ہے" اس کا بیان ہے :-

"ایک سات برس کی چھوٹی سی لڑکی جو ایک نہایت شایستہ خاندان کی چشم و چراغ تھی خود اپنے بڑے بھائی اور اس کے چند دوستوں سے ملوث ہوئی۔ ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ پانچ بچوں کا ایک گروہ جو دو لڑکیوں اور تین لڑکوں پر مشتمل تھا اور جنکے گھر پاس پاس واقع تھے باہم شہوانی تعلقات میں وابستہ پائے گئے اور انہوں نے دوسرے ہم سن بچوں کو بھی اسکی ترغیب دی۔ ان میں سب سے بڑے بچے کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ ایک اور واقعہ ایک ۹ سال کی بچی کا ہے جو بظاہر بہت حفاظت سے رکھی جاتی تھی۔ اس بچی کو متعدد "عشاق" کی منظور نظر ہونے کا فخر حاصل تھا۔"[1]

بالٹیمور (Baltimore) کے ایک ڈاکٹر کی رپورٹ ہے کہ ایک سال کے اندر اس شہر میں ایک ہزار سے زیادہ ایسے مقدمات پیش ہوئے جن میں بارہ برس سے کم عمر کی لڑکیوں کے ساتھ مباشرت کی گئی تھی۔[2]

یہ پہلا ثمرہ ہے اس ہیجان انگیز ماحول کا جس میں ہر طرف جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اسباب فراہم ہو گئے ہیں۔ امریکہ کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ "ہماری آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ آج کل جن حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے وہ اس قدر غیر فطری ہیں کہ لڑکے اور لڑکیوں کو دس پندرہ برس کی عمر ہی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ عشق رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ نہایت افسوسناک ہے۔

[1] صفحہ ۳۲۰

[2] صفحہ ۱۰۷

اس قسم کی قبل از وقت صنفی دلچسپیوں سے بہت برے نتائج رونما ہوسکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں - ان کا کم سے کم نتیجہ یہ ہے کہ نوعمر لڑکیاں اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں یا کم سنی میں شادیاں کرلیتی ہیں - اور اگر محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو خودکشی کرلیتی ہیں۔"

تعلیم کا مرحلہ اس طرح جن بچوں میں قبل از وقت صنفی احساسات بیدار ہو جاتے ہیں ان کے لیے پہلی تجربہ گاہ مدارس ہیں - مدرسے دو قسم کے ہیں - ایک قسم ان مدرسوں کی ہے جن میں ایک ہی صنف کے بچے داخل ہوتے ہیں - دوسری قسم ان مدرسوں کی جن میں تعلیم مخلوط ہے۔

پہلی قسم کے مدرسوں میں "محبت ہم جنس" (Homo-sexuality) اور "خودکاری" (Masturbation) کی وبا پھیل رہی ہے، کیونکہ جن جذبات کو بچپن ہی میں بھڑکایا جا چکا ہے، اور جنکو مشتعل کرنے کے سامان فضا میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، وہ اپنی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی صورت نکال لینے پر مجبور ہیں - ڈاکٹر ہوکر لکھتا ہے کہ اس قسم کی تعلیم گاہوں، کالجوں، نرسوں کے ٹریننگ اسکولوں اور مذہبی مدرسوں میں، ہمیشہ اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن میں ایک ہی صنف کے دو فرد آپس میں شہوانی تعلق رکھتے ہیں اور صنفِ مقابل سے ان کی دلچسپی فنا ہوچکی ہے[1] - اس سلسلہ میں اُس نے بکثرت واقعات ایسے بیان کیے ہیں جن میں لڑکیاں لڑکیوں کے ساتھ اور لڑکے لڑکوں کے ساتھ ملوّث ہوئے اور دردناک انجام سے دوچار ہوئے - بعض دوسری کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ "محبت ہم جنس" کی وبا کس قدر کثرت سے پھیلی ہوئی ہے - ڈاکٹر لوری (Dr. Lowry) اپنی کتاب (Herself.) میں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مدرسے کے ہیڈ ماسٹر نے ۰م خاندانوں کو خفیہ طریقہ سے اطلاع دی کہ ان کے لڑکے اب مدرسے میں نہیں رکھے جاسکتے کیونکہ ان میں "بد اخلاقی کی ایک خوفناک حالت" کا پتہ چلا ہے[2]۔

---

[1] صفحہ ۳۳۱ - [2] صفحہ ۱۷۹

اب دوسری قسم کے مدارس کو لیجیے جن میں لڑکیاں اور لڑکے ساتھ مل کر پڑھتے ہیں۔ یہاں اشتعال کے اسباب بھی موجود ہیں اور اسکو تسکین دینے کے اسباب بھی۔ جس ہیجانِ جذبات کی ابتدا بچپن میں ہوئی تھی یہاں پہنچکر اسکی تکمیل ہو جاتی ہے۔ بدترین قسم کا فحش لٹریچر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ عشقیہ افسانے، نام نہاد "آرٹ" کے رسالے، صنفی مسائل پر نہایت گندی کتابیں، اور منع حمل کی معلومات فراہم کرنے والے مضامین۔ یہ ہیں وہ چیزیں جو عنفوانِ شباب میں مدرسوں اور کالجوں کے طالبین و طالبات کے لیے سب سے زیادہ جاذبِ نظر ہوتی ہیں۔ مشہور امریکن مصنف ہینڈرچ فان لون (Hendrich von Loon) کہتا ہے کہ "یہ لٹریچر جسکی سب سے زیادہ مانگ امریکن یونیورسٹیوں میں ہے، گندگی، فحش اور بیہودگی کا بدترین مجموعہ ہے جو کسی زمانہ میں اسقدر آزادی کے ساتھ پبلک میں پیش نہیں کیا گیا۔" اس لٹریچر سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، دونوں صنفوں کے جوان افراد ان پر آپس میں نہایت آزادی اور بے باکی سے مباحثے کرتے ہیں، اور اسکے بعد عملی تجربات کی طرف قدم بڑھایا جاتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں مل کر (Petting parties) کے لیے نکلتے ہیں جن میں شراب اور سگرٹ کا استعمال خوب آزادی سے ہوتا ہے اور ناچ رنگ سے پورا لطف اٹھایا جاتا ہے[1]۔ لِنڈسے کا اندازہ ہے کہ ہائی اسکول کی کم از کم ۴۵ فیصدی لڑکیاں مدرسہ چھوڑنے سے پہلے خراب ہو چکتی ہیں اور بعد کے تعلیمی مدارج میں اوسط اس سے بہت زیادہ ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"لڑکیاں خود اس چیز کے لیے اُن لڑکوں سے اصرار کرتی ہیں جنکے ساتھ وہ تفریحی مشاغل کے لیے جاتی ہیں۔ اور اس قسم کے ہیجانات کی طلب میں انکی جسارت و بے باکی لڑکوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتی، اگرچہ زنانہ فطرت ان اقدامات پر لطیف فریب کاریوں کے پردے ڈال دیتی ہے۔" (صفحہ ۷۰)

دوسری جگہ لکھتا ہے:-

۱؎ How I Can Get Married, p. 172

"ہائی اسکول کا لڑکا بمقابلہ ہائی اسکول کی لڑکی کے اظہار جذبات کی شدت میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ عموماً لڑکی ہی کسی نہ کسی طرح پیش قدمی کرتی ہے، اور لڑکا اسکے اشاروں پر ناچتا ہے" (صفحہ ۵۰)

تین زبردست محرکات

مدرسے اور کالج میں پھر بھی ایک قسم کا ڈسپلن ہوتا ہے جو کسی حد تک آزادی عمل میں رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ نوجوان جب تعلیم گاہوں سے مشتعل جذبات اور بگڑی ہوئی عادات لیے ہوئے زندگی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو انکی شورش تمام حدود و قیود سے آزاد ہو جاتی ہے۔ یہاں انکے جذبات کو بھڑکانے کے لیے ایک پورا آتش خانہ موجود ہوتا ہے اور ان بھڑکے ہوئے جذبات کی تسکین کے لیے ہر قسم کا سامان بھی کسی وقت کے بغیر فراہم ہو جاتا ہے۔

ایک امریکن رسالہ میں ان اسباب کو، جنکی وجہ سے وہاں بد اخلاقی کی غیر معمولی اشاعت ہو رہی ہے اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"تین شیطانی قوتیں ہیں جنکی تثلیث آج ہماری دنیا پر چھا گئی ہے اور یہ تینوں ایک جہنم تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ فحش لٹریچر جو جنگ عظیم کے بعد سے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنی بے شرمی، اور کثرت اشاعت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ متحرک تصویریں جو شہوانی محبت کے جذبات کو نہ صرف بھڑکاتی ہیں بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں۔ عورتوں کا گرا ہوا اخلاقی معیار جو انکے لباس اور بسا اوقات انکی برہنگی، اور سگرٹ کے روز افزوں استعمال، اور مردوں کے ساتھ انکے ہر قید و امتیاز سے نا آشنا اختلاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تین چیزیں ہمارے ہاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور انکا نتیجہ مسیحی تہذیب و معاشرت کا زوال اور آخر کار کامل تباہی ہے۔ اگر انکو نہ روکا گیا تو ہماری تاریخ بھی روم اور ان دوسری قوموں کے مماثل ہوگی جنکو یہی نفس پرستی اور شہوانیت انکی شراب اور عورتوں اور ناچ رنگ سمیت فنا کے گھاٹ اتار چکی ہے"

یہ تین اسباب جو تمدن و معاشرت کی پوری فضا پر چھائے ہوئے ہیں ہر اس جوان مرد اور جوان عورت کے جذبات میں ایک دائمی تحریک پیدا کرتے رہتے ہیں جسکے جسم میں تھوڑا سا بھی گرم خون موجود ہے۔

فواحش کی کثرت، اس تحریک کا لازمی نتیجہ ہے۔

فواحش کی کثرت امریکہ میں جن عورتوں نے زناکاری کو مستقل پیشہ بنالیا ہے انکی تعداد کا کم سے کم اندازہ چار اور پانچ لاکھ کے درمیان ہے[1]۔ مگر امریکہ کی بیسوا کو ہندوستان کی بیسوا پر قیاس نہ کریجیے وہ خاندانی بیسوا نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی عورت ہے جو کل تک کوئی آزاد پیشہ کرتی تھی۔ بری صحبت میں خراب ہوگئی اور قحبہ خانے میں آن بیٹھی۔ چند سال یہاں گذارے گی۔ پھر اس کام کو چھوڑ کر کسی دفتر یا کارخانہ میں ملازم ہو جائے گی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ کی ۵۰ فیصدی بیسوائیں خانگی ملازموں (domestic servants) میں سے بھرتی ہوتی ہیں اور باقی پچاس فیصدی ہسپتالوں دفتروں اور دوکانوں کی ملازمتیں چھوڑ کر آتی ہیں۔ عموماً پندرہ اور بیس سال کے درمیان عمر میں یہ پیشہ شروع کیا جاتا ہے اور پچیس (۲۵) تیس (۳۰) سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ عورت جو کل تک بیسوا تھی قحبہ خانے سے منتقل ہو کر کسی دوسرے آزاد پیشے میں چلی جاتی ہے[2]۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں چار یا پانچ لاکھ بیسواؤں کی موجودگی درحقیقت کیا معنی رکھتی ہے۔

جیسا کہ پچھلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے مغربی ممالک میں فاحشہ گری ایک منظم بین الاقوامی کاروبار کی حیثیت رکھتی ہے۔ امریکہ میں نیویارک، ریوڈی جنیرو اور بیونس آئرس اس کاروبار کی بڑی منڈیاں ہیں۔ نیویارک کی دو سب سے بڑی "تجارتی کوٹھیوں" میں سے ہر ایک کی ایک ایک انتظامی کونسل ہے جسکے صدر، نائب صدر اور سکرٹری باقاعدہ انتخاب کیے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے قانونی مشیر مقرر کر رکھے ہیں تاکہ کسی عدالتی قضیہ میں پھنس جانے کی صورت میں ان کے مفاد کی حفاظت کریں۔ جوان لڑکیوں کو بہکانے اور اڑا کر لانے کے لیے ہزار ہا دلال مقرر ہیں جو ہر جگہ شکار کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ ان شکاریوں کی دسترس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شکاگو میں آنے والے مہاجرین کی لیگ کے صدر نے ایک مرتبہ ۱۵ مہینے کے اعداد و شمار جمع کیے تھے تو معلوم ہوا کہ اس مدت میں ۷۰۰ لڑکیوں کے خطوط لیگ کے دفتر کو موصول

[1] Prostitution in the United States, p. 38

[2] ایضاً ص ۶۹-۶۴

ہوئے جن میں لکھا تھا کہ وہ شکاگو پہنچنے والی ہیں، مگر ان میں سے صرف ۱۷۰۰ اپنی منزل مقصود کو پہنچ سکیں۔ باقی پانچ ہزار کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گئیں۔

قحبہ خانوں کے علاوہ بکثرت ملاقات خانے (Assignation Houses) اور (Call Houses) ہیں، جو اس غرض کے لیے آراستہ رکھے جاتے ہیں کہ "شریف" اصحاب اور خواتین جب باہم ملاقات فرمانا چاہیں تو وہاں انکی ملاقات کا انتظام کر دیا جائے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ایک شہر میں ایسے ۷۸ مکان تھے۔ ایک دوسرے شہر میں ۴۳۔ ایک اور شہر میں ۳۳۔[۱] ان مکانوں میں صرف بن بیاہی خواتین ہی نہیں جاتیں بلکہ بہت سی بیاہی ہوئی خواتین کا بھی وہاں گذر ہوتا رہتا ہے۔[۲] ایک مشہور ریفارمر کا بیان ہے کہ "نیویارک کی شادی شدہ آبادی کا پورا ایک تہائی حصہ ایسا ہے جو اخلاقی اور جسمانی حیثیت سے اپنی ازدواجی ذمہ داریوں میں وفادار نہیں ہے۔ اور نیویارک کی حالت ملک کے دوسرے حصوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔[۳]"

امریکہ کے مصلحین اخلاق کی ایک مجلس (Committee of Fourteen) کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلس کی طرف سے بداخلاقی کے مرکزوں کی تلاش اور ملک کی اخلاقی حالت کی تحقیقات اور اصلاح اخلاق کی عملی تدابیر کا کام بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ اسکی رپورٹوں میں بیان کیا گیا ہے کہ امریکہ کے جتنے رقص خانے، نائٹ کلب، حسن گاہیں (Beauty-Saloons)، ہاتھوں کو خوبصورت بنانے کی دوکانیں (Manicure-Shops)، مالش کدے (Massage-Rooms) اور بال سنوارنے کی دوکانیں (Hair-Dressings) ہیں قریب قریب سب کے سب باقاعدہ

[۱] Prostitution in the United States, pp. 138-39

[۲] *Ibid*, p. 96

[۳] Herself. p. 116

قحبہ خانے بن چکے ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر۔ کیونکہ وہاں ناقابلِ بیان افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

امراض خبیثہ | فواحش کی اس کثرت کا لازمی نتیجہ امراض خبیثہ کی کثرت ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ کی قریب قریب ۹۰ فیصدی آبادی ان امراض سے متاثر ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے سرکاری دواخانوں میں اوسطاً ہر سال آتشک کے ۲ لاکھ اور سوزاک کے ایک لاکھ ۶۰ ہزار مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ (۶۵۰) دواخانے صرف انہی امراض کے لیے مخصوص ہیں۔ مگر سرکاری دواخانوں سے زیادہ مرجوعہ پرائیویٹ ڈاکٹروں کا ہے جنکے پاس آتشک کے ۶۱ فیصدی اور سوزاک کے ۸۹ فیصدی مریض جاتے ہیں۔ (جلد ۲۳ صفحہ ۴۵)

تیس اور چالیس ہزار کے درمیان بچوں کی اموات صرف موروثی آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ دق کے سوا بقیہ تمام امراض سے جتنی موتیں واقع ہوتی ہیں ان سب سے زیادہ تعداد اُن اموات کی ہے جو صرف آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ سوزاک کے متعلق ماہرین کا کم سے کم تخمینہ ہے کہ ۶۰ فیصدی جوان اشخاص اس مرض میں مبتلا ہیں، جن میں شادی شدہ بھی ہیں اور غیر شادی شدہ بھی۔ امراض نسواں کے ماہرین کا متفقہ بیان ہے کہ شادی شدہ عورتوں کے اعضاء جنسی پر جتنے آپریشن کیے جاتے ہیں ان میں سے ۷۵ فیصدی ایسی نکلتی ہیں جن میں سوزاک کا اثر پایا جاتا ہے۔[1]

طلاق اور تفریق | ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ خاندان کا نظم اور ازدواج کا مقدس رابطہ کہاں قائم رہ سکتا ہے۔ آزادی کے ساتھ اپنی روزی کمانے والی عورتیں جنکو شہوانی ضروریات کے سوا اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی مرد کی ضرورت نہیں ہے، اور جنکو شادی کے بغیر آسانی کے ساتھ مرد مل بھی سکتے ہیں، شادی کو ایک فضول چیز سمجھتی ہیں۔ جدید فلسفہ اور مادّہ پرستانہ خیالات نے ان کے وجدان سے یہ احساس بھی دور کر دیا ہے کہ شادی کے بغیر کسی شخص سے تعلقات رکھنا کوئی عیب یا گناہ ہے۔ سوسائٹی کو بھی اس ماحول

[1] Laws of Sex, p. 204

نے اسقدر بے حس بنا دیا ہے کہ وہ ایسی عورتوں کو قابل نفرت یا ملامت نہیں سمجھتی۔ جج لنڈسے امریکہ کی عام لڑکیوں کے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"میں شادی کیوں کروں؟ میرے ساتھ کی جن لڑکیوں نے گذشتہ دو سال میں شادیاں کی ہیں، ہر دس میں سے پانچ کی شادی کا انجام طلاق پر ہوا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس زمانہ کی ہر لڑکی محبت کے معاملہ میں آزادی عمل کا فطری حق رکھتی ہے۔ ہم کو منع حمل کی کافی تدبیریں معلوم ہیں۔ اس ذریعہ سے یہ خطرہ بھی دور کیا جاسکتا ہے کہ ایک حرامی بچے کی پیدائش کوئی پیچیدہ صورت حال پیدا کر دے گی۔ ہم کو یقین ہے کہ روایتی طریقوں کو اس جدید طریقہ سے بدل دینا عقل عام کا مقتضا ہے۔"

ان خیالات کی بے شرم عورتوں کو اگر کوئی چیز شادی پر آمادہ کرتی ہے تو وہ صرف جذبہ محبت ہے۔ لیکن اکثر یہ جذبہ بھی دل اور روح کی گہرائی میں نہیں ہوتا، بلکہ محض ایک عارضی کشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خواہشات کا نشہ اتر جانیکے بعد زوجین میں کوئی الفت باقی نہیں رہتی۔ مزاج اور عادت کی ادنیٰ ناموافقت ان کے درمیان منافرت پیدا کر دیتی ہے۔ آخر کار عدالت میں طلاق یا تفریق کا دعویٰ پیش ہو جاتا ہے۔ لنڈسے لکھتا ہے:۔

"۱۹۲۲ء میں ڈِنوَر میں ہر شادی کے ساتھ ایک واقعہ تفریق کا پیش آیا، اور ہر دو شادیوں کے مقابلہ میں ایک مقدمہ طلاق کا پیش ہوا۔ یہ حالت محض ڈنوَر ہی کی نہیں ہے۔ امریکہ کے تقریباً تمام شہروں کی قریب قریب یہی حالت ہے۔"

پھر لکھتا ہے:۔

"طلاق اور تفریق کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں اور اگر یہی حالت رہی جیسی کہ امید ہے تو غالباً ملک کے اکثر حصوں میں جتنے شادی کے لائسنس دیے جائینگے اتنے ہی طلاق کے مقدمے پیش ہونگے۔"[ل]

ل Revolt of Modern Youth, p. 211-14

کچھ عرصہ ہوا کہ ڈیٹرائے (Derroit) کے اخبار "فری پریس" میں ان حالات پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا ایک فقرہ یہ ہے۔

"نکاحوں کی کمی، طلاقوں کی زیادتی، اور نکاح کے بغیر مستقل یا عارضی ناجائز تعلقات کی کثرت یہ معنی رکھتی ہے کہ ہم حیوانیت کی طرف واپس جارہے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کی فطری خواہش مٹ رہی ہے۔ پیدا شدہ بچوں سے غفلت برتی جارہی ہے۔ اور اس امر کا احساس رخصت ہو رہا ہے کہ خاندان اور گھر کی تعمیر، تہذیب اور آزاد حکومت کے بقا کے لیے ضروری ہے۔ اسکے برعکس تہذیب اور حکومت کے انجام سے ایک بے وروانہ بے اعتنائی پیدا ہو رہی ہے۔"

طلاق و تفریق کی اس کثرت کا علاج اب یہ نکالا گیا ہو کہ (Companionate Marriage) یعنی "آزمائشی نکاح" کو رواج دیا جائے۔ مگر یہ علاج اصل مرض سے بھی بدتر ہے۔ آزمائشی نکاح کے معنی یہ ہیں کہ مرد اور عورت "پرانے فیشن" کی شادی کیے بغیر کچھ عرصہ تک باہم مل کر رہیں۔ اگر اس یکجائی میں دل سے دل مل جائے تو شادی کریں، ورنہ دونوں الگ ہو کر کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔ دوران آزمائش میں دونوں کو اولاد پیدا کرنے سے پرہیز کرنا لازم ہے، کیونکہ بچے کی پیدائش کے بعد انکو باضابطہ نکاح کرنا پڑے گا۔ یہ وہی چیز ہے جسکا نام روس میں آزاد محبت (free love) ہے۔

قومی خودکشی نفس پرستی، ازدواجی ذمہ داریوں سے نفرت، خاندانی زندگی سے بیزاری، اور ازدواجی تعلقات کی ناپائداری نے عورت کے اُس فطری جذبۂ مادری کو قریب قریب فنا کردیا ہے جو نسوانی جذبات میں سب سے زیادہ اشرف و اعلیٰ روحانی جذبہ ہے، اور جسکے بقا پر نہ صرف تمدن و تہذیب، بلکہ انسانیت کے بقاء کا انحصار ہے۔ منع حمل، اسقاطِ حمل اور قتلِ اطفال اسی جذبہ کی موت سے پیدا ہوئے ہیں۔ منع حمل کی معلومات ہرقسم کی قانونی پابندیوں کے باوجود ممالک متحدہ امریکہ میں ہر جوان لڑکی اور لڑکے کو حاصل ہیں۔ منع حمل دوائیں اور آلات بھی آزادی کے ساتھ دوکانوں پر فروخت ہوتے ہیں۔ عام آزاد عورتیں تو درکنار مدرسوں اور

کالجوں کی لڑکیاں بھی اس سامان کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہیں، تاکہ اگر ان کا دوست اتفاقاً اپنا سامان بھول آئے تو ایک پرلطف شام ضائع نہ ہونے پائے۔ جج لنڈسے لکھتا ہے:۔

"ہائی اسکول کی عمر والی ۴۹۵ لڑکیاں جنھوں نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ انکو لڑکوں سے صنفی تعلقات کا تجربہ ہو چکا ہے، ان میں سے صرف ۲۵ ایسی تھیں جنکو حمل ٹھیر گیا تھا۔ ان میں سے بعض تو اتفاقاً بچ گئی تھیں۔ لیکن اکثر کو منع حمل کی موثر تدابیر کا کافی علم تھا۔ یہ واقفیت ان میں اتنی عام ہو چکی ہے کہ لوگوں کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔"

کنواری لڑکیاں ان تدابیر کو اس لیے استعمال کرتی ہیں کہ انکی آزادی میں فرق نہ آئے شادی شدہ عورتیں اس لیے ان سے استفادہ کرتی ہیں کہ بچہ کی پیدائش سے نہ صرف ان پر تربیت اور تعلیم کا بار پڑ جاتا ہے، بلکہ شوہر کو طلاق دینے کی آزادی میں بھی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تمام عورتیں اس لیے ماں بننے سے نفرت کرنے لگی ہیں کہ زندگی کا پورا پورا لطف اٹھانے کے لیے اُن کو اس جنجال سے بچنے کی ضرورت ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ ان کے نزدیک بچے جننے سے ان کے حسن میں فرق آجاتا ہے۔[1] بہر حال اسباب خواہ کچھ بھی ہوں۔ ۹۵ فیصدی تعلقات مرد و زن ایسے ہیں جن میں اس تعلق کے فطری نتیجے کو منع حمل کی تدبیروں سے روک دیا جاتا ہے۔ باقی ماندہ پانچ فیصدی حوادث جن میں اتفاقاً حمل قرار پا جاتا ہے، ان کے لیے اسقاط اور قتل اطفال کی تدبیریں موجود ہیں۔ جج لنڈسے کا بیان ہے کہ امریکہ میں ہر سال کم از کم ۱۵ لاکھ حمل ساقط کیے جاتے ہیں۔ اور ہزار ہا بچے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیے جاتے ہیں (صفحہ ۲۲۰)

انگلستان کی حالت میں ان افسوسناک تفصیلات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ مگر ناممکن ہے کہ اس حصۂ بحث کو جارج رائیلی اسکاٹ کی کتاب تاریخ الفحشار (A History of Prostitution) کے چند اقتباسات نقل کیے بغیر ختم کر دیا جائے۔ اس کتاب کا مصنف ایک انگریز ہے اور اس نے

[1] Macfadden, Manhood and Marriage. p. 82.

زیادہ تر اپنے ہی ملک کی اخلاقی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

"جن عورتوں کی بسر اوقات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اپنے جسم کو کرایہ پر چلا کر روزی کمائیں، انکے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد اُن عورتوں کی بھی ہے (اور وہ روز بروز زیادہ ہو رہی ہے) جو اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع رکھتی ہیں اور ضمنی طور پر اسکے ساتھ ساتھ فاحشہ گری بھی کرتی ہیں تاکہ آمدنی میں کچھ اور اضافہ ہو جائے - یہ پیشہ ور فاحشات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں، مگر اس نام کا اطلاق ان پر کیا نہیں جاتا - ہم انکو غیر پیشہ ور فاحشات (Amateur Prostitutes) کہہ سکتے ہیں ......"

" ان شوقین (یا غیر پیشہ ور) فاحشات کی کثرت آج کل جتنی ہے اتنی کبھی نہ تھی - سوسائٹی کے نیچے سے لیکر اوپر تک ہر طبقہ میں پائی جاتی ہیں - اگر ان معزز خواتین کو کہیں اشارے کنایے میں بھی "فاحشہ" کہدیا جائے تو یہ آگ بگولا ہو جائینگی - مگر انکی ناراضی سے حقیقت نہیں بدل سکتی - حقیقت بہرحال یہی ہے کہ ان میں اور پکاڈلی کی کسی بڑی سے بڑی بے شرم بیسوا میں بھی اخلاقی حیثیت سے کوئی وجہ امتیاز نہیں ہے - ..... اب جوان لڑکیوں کے لیے بدچلنی اور بے باکی، بلکہ سوقیانہ اطوار تک فیشن میں داخل ہو گئے ہیں - اور سگریٹ پینا، تلخ شرابیں استعمال کرنا، ہونٹوں پر سرخی لگانا، صنفیات اور منع حمل کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کرنا، فحش لٹریچر پر گفتگو کرنا، یہ سب چیزیں بھی ان کے لیے فیشن بنی ہوئی ہیں - ...... ایسی لڑکیوں اور عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو شادی سے پہلے صنفی تعلقات بلا تکلف قائم کر لیتی ہیں - اور وہ لڑکیاں اب شاذ کے حکم میں ہیں جو کلیسا کی قربانگاہ کے سامنے نکاح کا پیمان وفا باندھتے وقت صحیح معنوں میں دوشیزہ ہوتی ہوں "

آگے چل کر یہ مصنف ان اسباب کا تجزیہ کرتا ہے جو حالات کو اس حد تک پہنچا دینے کے موجب ہوئے ہیں - اور مناسب تر یہ ہے - کہ اس تجزیہ کو بھی اسی کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جائے :

"سب سے پہلے اُس شوق آرائش کو لیجیے جس کی وجہ سے ہر لڑکی میں نئے فیشن کے قیمتی لباسوں اور حسن افزائی کے مختلف النوع سامانوں کی بے پناہ حرص پیدا ہو گئی ہے۔ یہ اس بے ضابطہ شہوت گری کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے۔ ہر شخص جو دیکھنے والی آنکھیں رکھتا ہے اس بات کو بآسانی دیکھ سکتا ہے کہ وہ سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں جو اسکے سامنے سے روزانہ گذرتی ہیں عموماً اتنے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہوتی ہیں کہ انکی جائز کمائی کسی طرح بھی ایسے لباسوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا آج بھی یہ کہنا اتنا ہی صحیح ہے جتنا نصف صدی پہلے صحیح تھا کہ مرد ہی ان کے لیے کپڑے خریدتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جو مرد ان کے لیے کپڑے خریدتے تھے وہ ان کے شوہر یا باپ بھائی ہوتے تھے اور اب ان کے بجائے کچھ دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔

"عورتوں کی آزادی کا بھی ان حالات کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں لڑکیوں پر سے والدین کی حفاظت و نگرانی اس حد تک کم ہو گئی ہے کہ تیس چالیس سال قبل لڑکوں کو بھی اتنی آزادی حاصل نہ تھی جتنی اب لڑکیوں کو حاصل ہے۔

"ایک اور اہم سبب، جو سوسائٹی میں وسیع پیمانہ پر صنفی آوارگی پھیلنے کا موجب ہوا ہے، یہ ہے کہ عورتیں روز افزوں تعداد میں تجارتی کاروبار، دفتری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں داخل ہو رہی ہیں جہاں شب و روز ان کو مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس چیز نے عورتوں اور مردوں کے اخلاقی معیار کو بہت گرا دیا ہے۔ مردانہ اقدامات کے مقابلہ میں عورت کی قوت مزاحمت کو بہت کم کر دیا ہے، اور دونوں صنفوں کے شہوانی تعلق کو تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد کر کے رکھ دیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب جوان لڑکیوں کے ذہن میں شادی اور باعصمت زندگی کا خیال آتا ہی نہیں۔ آزادانہ "خوش وقتی" جسے پہلے کبھی آوارہ قسم کے مرد ڈھونڈھتے پھرتے تھے، آج ہر لڑکی اس کی جستجو کرتی پھرتی ہے۔ دوشیزگی اور بکارت کو ایک دقیانوسی چیز سمجھا

جاتا ہے اور دورِ جدید کی لڑکی اس کو ایک مصیبت خیال کرتی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا لطف یہ ہے کہ عہدِ شباب میں لذاتِ نفس کا جام خوب جی بھر کے پیا جائے۔ اسی چیز کی تلاش میں وہ رقص خانوں، نائٹ کلبوں اور ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے چکر لگاتی ہے، اور اسی کی جستجو میں وہ بالکل اجنبی مردوں کے ساتھ موٹر کی سیر کے لیے بھی جانے پر آمادہ ہو جاتی ہے دوسرے الفاظ میں وہ جان بوجھ کر خود اپنی خواہش سے اپنے آپ کو ایسے ماحول میں اور ایسے حالات میں پہنچا دیتی ہے اور پہنچاتی رہتی ہے جو صنفی جذبات کو مشتعل کرنے والے ہیں۔ اور پھر اسکے جو قدرتی نتائج ہیں ان سے وہ گھبراتی نہیں ہے بلکہ انکا خیر مقدم کرتی ہے۔"

فیصلہ کُن سوال

ہندوستان میں اور دوسرے مشرقی ممالک میں جو لوگ پردے کی مخالفت کرتے ہیں ان کے سامنے دراصل زندگی کا یہی نقشہ ہے۔ اسی زندگی کے تابناک مظاہر نے انکے حواس کو متاثر کیا ہے۔ یہی نظریات ہیں اخلاقی اصول، اور یہی مادّی و حسّی فوائد و لذائذ ہیں جنکے روشن پہلو نے ان کے دل و دماغ کو اپیل کیا ہے۔ پردہ سے انکی نفرت اسی بنا پر ہے کہ اُسکا بنیادی فلسفۂ اخلاق اس مغربی فلسفۂ اخلاق کی ضد ہے جس پر یہ ایمان لائے ہیں، اور عملاً اُن فائدوں اور لذتوں کے حصول میں مانع ہے جنکو ان حضرات نے مقصود بنا لیا ہے۔ اب یہ سوال کہ اس نقشۂ زندگی کے تاریک پہلو، یعنی اسکے عملی نتائج کو بھی یہ لوگ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں، تو اس باب میں انکے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ ایک گروہ ان نتائج کو جانتا ہے اور انہیں قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ درحقیقت اسکے نزدیک یہ بھی مغربی زندگی کا روشن پہلو ہی ہے نہ کہ تاریک۔ دوسرا گروہ اس پہلو کو تاریک سمجھتا ہے، ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، مگر ان فائدوں کا بُری طرح فریفتہ ہے جو اس طرزِ زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تیسرا گروہ نہ تو نظریات ہی کو سمجھتا ہے، نہ انکے نتائج سے واقف ہے، اور نہ اس بات پر غور و فکر کی زحمت اٹھانا چاہتا ہے کہ ان نظریات اور ان نتائج کے درمیان کیا تعلق ہے۔ اسکو تو بس وہ کام کرنا ہے جو دنیا میں ہو رہا ہے ——— یہ تینوں گروہ باہم کچھ اس طرح مخلوط ہو گئے ہیں کہ گفتگو کے وقت بسا اوقات یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہمارا مخاطب دراصل کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی اختلاط کی وجہ سے عموماً سخت خلط مبحث پیش آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انکو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کیا جائے اور ہر ایک سے اس کی حیثیت کے

مطابق بات کی جائے۔

مشرقی مستغربین | پہلے گروہ کے لوگ اس فلسفہ اور ان نظریات پر، اور ان تمدنی اصولوں پر علی وجہ البصیرت ایمان لائے ہیں جن پر مغربی تہذیب تمدن کی بنا رکھی گئی ہے۔ وہ اسی دماغ سے سوچتے ہیں، اور اسی نظر سے زندگی کے مسائل کو دیکھتے ہیں جس سے جدید یورپ کے معماروں نے دیکھا اور سوچا تھا۔ اور وہ خود اپنے اپنے ملکوں کی تمدنی زندگی کو بھی اسی مغربی نقشہ پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ عورت کی تعلیم کا منتہائے مقصود ان کے نزدیک واقعی یہی ہے کہ وہ کمانے کی قابلیت بہم پہنچائے، اور اس کے ساتھ دل لبھانے کے فنون سے بھی کماحقہٗ واقف ہو۔ خاندان میں عورت کی صحیح حیثیت ان کے نزدیک درحقیقت یہی ہے کہ وہ مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا رکن بنے اور مشترک بجٹ میں اپنا حصہ پورا پورا ادا کرے۔ سوسائیٹی میں عورت کا اصلی مقام ان کی رائے میں یہی ہے کہ وہ اپنے حسن، اپنی آرائش اور اپنی اداؤں سے اجتماعی زندگی میں ایک عنصر لطیف کا اضافہ کرے، اپنی خوش گفتاری سے دلوں میں حرارت پیدا کرے، اپنی موسیقی سے کانوں میں رس بھر دے، اپنے رقص سے روحوں کو وجد میں لائے اور تھرک تھرک کر اپنے جسم کی ساری خوبیاں آدم کے بیٹوں کو دکھائے تاکہ انکے دل خوش ہوں، انکی نگاہیں لذت یاب ہوں، اور اُنکے ٹھنڈے خون میں تھوڑی سی گرمی آجائے۔ حیات قومی میں عورت کا کام انکے خیال میں فی الواقع اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ سوشل ورک کرتی پھرے، میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں جائے، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں شریک ہو، سیاسی اور تمدنی اور معاشرتی مسائل کو سلجھانے میں اپنا وقت اور دماغ صرف کرے، ورزشوں اور کھیلوں میں حصہ لے، تیراکی اور دوڑ اور کود پھاند اور لمبی لمبی اُڑانوں کے ریکارڈ توڑے، غرض وہ سب کچھ کرے جو گھر سے باہر ہے اور اس سے کچھ غرض نہ رکھے جو گھر کے اندر ہے۔ اس زندگی کو وہ آئیڈیل زندگی سمجھتے ہیں۔ انکے نزدیک دنیوی ترقی کا یہی ایک راستہ ہے اور اس راستہ پر جانے میں جتنے پرانے اخلاقی نظریات مانع ہیں وہ سب کے سب محض لغو اور سراسر باطل ہیں۔ اس نئی زندگی کے لیے پرانی اخلاقی قدروں

(Moral values) کو انہوں نے اسی طرح نئی قدروں سے بدل لیا ہے جس طرح یورپ نے بدلا ہے۔ مادی فوائد اور جسمانی لذتیں انکی نگاہ میں زیادہ بلکہ اصلی قدر و قیمت رکھتی ہیں، اور انکے مقابلہ میں حیا، عصمت، طہارتِ اخلاق، ازدواجی زندگی کی وفاداری، نسب کی حفاظت، اور اسی قبیل کی دوسری تمام چیزیں نہ صرف یہ کہ بے قدر ہیں، بلکہ دقیانوسی تاریک خیالی کے ڈھکوسلے ہیں جنہیں ختم کیے بغیر ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہ لوگ دراصل دینِ مغربی کے سچے مومن ہیں اور جس نظریہ پر یہ ایمان لائے ہیں اس کو اُن تمام تدبیروں سے، جو یورپ میں اس سے پہلے اختیار کی جا چکی ہیں، مشرقی ممالک میں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نیا ادب سب سے پہلے ان کے لٹریچر کو لیجیے جو دماغوں کو تیار کرنے والی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس نام نہاد ادب —— دراصل بے ادبی —— میں پوری کوشش اس امر کی کی جارہی ہے کہ نئی نسلوں کے سامنے اس نئے اخلاقی فلسفہ کو مزین بنا کر پیش کیا جائے اور پرانی اخلاقی قدروں کو دل و دماغ کے ایک ایک ریشے سے کھینچ کر نکال ڈالا جائے۔ مثال کے طور پر میں یہاں اردو کے نئے ادب سے چند نمونے پیش کرونگا۔

ہندوستان کے ایک مشہور ماہ نامے میں، جسکو ادبی حیثیت سے اس ملک میں کافی وقعت حاصل ہے، ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "شیریں کا سبق"۔ صاحبِ مضمون ایک ایسے صاحب ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، ادبی حلقوں میں مشہور اور ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان صاحبزادی اپنے اُستاد سے سبق پڑھنے بیٹھی ہیں اور درس کے دوران میں اپنے ایک نوجوان دوست کا نامۂ محبت اُستاد کے سامنے بغرض مطالعہ و مشورہ پیش فرماتی ہیں۔ اس "دوست" سے انکی ملاقات کسی چائے پارٹی میں ہوگئی تھی۔ وہاں "کسی لیڈی" نے تعارف کی رسم ادا کر دی"۔ اس دن سے میل جول اور مراسلت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب صاحبزادی یہ چاہتی ہیں کہ اُستاد جی انکو اس دوست کے محبت ناموں کا "اخلاقی جواب" لکھنا سکھا

دیں - اُستاد کوشش کرتا ہے کہ لڑکی کو ان بیہودگیوں سے ہٹا کر پڑھنے کی طرف راغب کرے - لڑکی جواب دیتی ہے کہ :

"پڑھنا تو میں چاہتی ہوں مگر ایسا پڑھنا جو میرے جاگتے کے خوابوں کی آرزوؤں میں کامیاب ہونے میں مدد دے - نہ ایسا پڑھنا کہ مجھے ابھی سے بُڑھیا بنا دے"

استاد پوچھتا ہے "کیا اِن حضرت کے علاوہ تمہارے اور بھی کچھ نوجوان دوست ہیں" ہولائق شاگرد جواب دیتی ہے "کئی ہیں مگر اس نوجوان میں یہ خصوصیت ہے کہ بڑے مزے سے جھڑک دیتا ہے" - استاد کہتا ہے کہ اگر تمہارے ابا کو تمہاری اس خط و کتابت کا پتہ چل جائے تو کیا ہو؟ صاحبزادی جواب دیتی ہیں :

"کیا ابا نے شباب میں اس قسم کے خط نہ لکھے ہونگے؟ اچھے خاصے فیشن ایبل ہیں - کیا تعجب ہے کہ اب بھی لکھتے ہوں - خدانخواستہ بوڑھے نہیں ہو گئے ہیں"

استاد کہتا ہے کہ "آج سے پچاس برس پہلے تو یہ خیال بھی ناممکن تھا کہ کسی شریف زادی کو محبت کا خط لکھا جائے" شریف زادی صاحبہ جواب میں فرماتی ہیں :

"تو کیا اس زمانہ کے لوگ صرف بدذاتوں سے ہی محبت کرتے تھے - بڑے مزے میں تھے اس زمانے کے بدذات اور بڑے بدمعاش تھے اس زمانہ کے شریف"

"شیریں" کے آخری الفاظ، جن پر مضمون نگار نے گویا اپنے ادیبانہ تفلسف کی تان توڑی ہے یہ ہیں :

"ہم لوگوں (یعنی نوجوانوں) کی دُہری ذمہ داری ہے - وہ مسرتیں جو ہمارے بزرگ کھو چکے دوبارہ زندہ کریں، اور وہ غصہ اور جھوٹ کی عادتیں جو زندہ ہیں انہیں دفن کریں"

ایک اور نامور ادبی رسالہ میں اب سے ڈیڑھ دو سال پہلے ایک مختصر افسانہ "پشیمانی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کا خلاصہ سیدھے سادے الفاظ میں یہ تھا کہ ایک شریف خاندان کی بن بیاہی لڑکی ایک شخص سے آنکھ

لڑاتی ہے۔ اپنے باپ کی غیر موجودگی، اور ماں کی لاعلمی میں اسکو چپکے سے بلا لیتی ہے۔ ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں حمل قرار پا جاتا ہے۔ اسکے بعد وہ اپنے اس ناپاک فعل کو حق بجانب ٹھیرانے کے لیے دل ہی دل میں یوں استدلال کرتی ہے:

"میں پریشان کیوں ہوں؟ میرا دل دھڑکتا کیوں ہے؟ .... کیا میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے؟ کیا میں اپنی کمزوری پر نادم ہوں؟ شاید ہاں۔ لیکن اُس رومانی چاندنی رات کی داستان تو میری کتاب زندگی میں سنہری الفاظ سے لکھی ہوئی ہے۔ شباب کے مست لمحات کی اس یاد کو تو اب بھی میں اپنا سب سے زیادہ عزیز خزانہ سمجھتی ہوں۔ کیا میں ان لمحات کو واپس لانے کے لیے اپنا سب کچھ دینے کے لیے تیار نہیں؟......

"پھر کیوں میرا دل دھڑکتا ہے؟ کیا گناہ کے خوف سے؟ کیا میں نے گناہ کیا؟ نہیں میں نے گناہ نہیں کیا۔ میں نے کس کا گناہ کیا؟ میرے گناہ سے کس کو نقصان پہنچا؟ میں نے تو قربانی کی۔ قربانی اُس کے لیے، کاش کہ میں اسکے لیے اور بھی قربانی کرتی! گناہ سے میں نہیں ڈرتی۔ لیکن ہاں شاید میں اس چڑیل سوسائٹی سے ڈرتی ہوں۔ اس کی کیسی کیسی معنی خیز اشتباہ آمیز نظریں مجھ پر پڑتی ہیں.......

"آخر میں اس سے کیوں ڈرتی ہوں؟ اپنے گناہ کے باعث؟ لیکن میرا گناہ ہی کیا ہے؟ کیا جیسا میں نے کیا ویسا ہی سوسائٹی کی کوئی اور لڑکی نہ کرتی؟ وہ سہانی رات اور وہ تنہائی۔ وہ کتنا خوبصورت تھا۔ اس نے کیسے میرے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔ اور اپنی آغوش میں مجھے کھینچ لیا، بھینچ لیا۔ اُف اس کے گرم اور خوشبودار سینے سے میں کس اطمینان سے چمٹ گئی۔ میں نے ساری دنیا ٹھکرا دی اور اپنا سب کچھ ان چند لمحاتِ عیش پر بیچ دیا۔ پھر کیا ہوا؟ کوئی اور کیا کرتا؟ کیا دنیا کی کوئی عورت اس وقت اس کو ٹھکرا سکتی تھی؟......

"گناہ ؟ میں نے ہرگز گناہ نہیں کیا۔ میں ہرگز نادم نہیں ہوں۔ میں پھر وہی کرنے کو تیار ہوں ..... عصمت ؟ عصمت ہے کیا ؟ صرف کنوارپن ؟ یا خیالات کی پاکیزگی ؟ میں کنواری نہیں رہی، لیکن کہاں میں نے اپنی عصمت کھودی ؟ .....

"فسادی چڑیل سوسائیٹی کو جو کچھ کرنا ہو کرے۔ وہ میرا کیا کر سکتی ہے ؟ کچھ نہیں۔ میں اسکی پُرحماقت انگشت نمائی سے کیوں جھینپوں ؟ میں اسکی کاناپھوسی سے کیوں ڈروں ؟ کیوں اپنا چہرہ زرد کروں ؟ میں اسکے بے معنی تمسخر سے کیوں منہ چھپاؤں ؟ میرا دل کہتا ہے کہ میں نے ٹھیک کیا، اچھا کیا، خوب کیا۔ پھر میں کیوں چور بنوں ؟ کیوں نہ بیانگ دہل اعلان کردوں کہ میں نے ایسا کیا اور خوب کیا ؟"

یہ طرزِ استدلال اور یہ طرزِ فکر ہے جو ہمارا "نئے زمانہ کا ادیب" ہر لڑکی ــــ شائد خود اپنی بہن اور بیٹی کو بھی ــــ سکھانا چاہتا ہے۔ اسکی تعلیم یہ ہے کہ ایک جوان لڑکی کو چاندنی رات میں جو گرم سینہ بھی مل جائے اس سے اسکو چمٹ جانا چاہیے کیونکہ اس صورت حال میں یہی ایک طریق کار ممکن ہے، اور جو عورت بھی ایسی حالت میں ہو وہ اسکے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ یہ فعل گناہ نہیں بلکہ "قربانی" ہے۔ اور اس سے عصمت پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔ بھلا خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ کنوارپن کو قربان کر دینے سے بھی کہیں عصمت جاتی ہوگی! اس سے تو عصمت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے کہ ایک عورت کی زندگی میں اسے سنہری الفاظ سے لکھا جانا چاہیے، اور اُسکی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اُسکی ساری کتاب زندگی ایسے ہی سنہرے الفاظ میں لکھی ہوئی ہو۔ رہی سوسائیٹی، تو وہ اگر ایسی عصمت مآب خواتین پر حرف رکھتی ہے تو وہ فسادی اور چڑیل ہے۔ قصوروار وہ خود ہے کہ ایسی ایثار پیشہ لڑکیوں پر حرف رکھتی ہے، نہ کہ وہ صاحبزادی جو ایک رومانی رات میں کسی کھلی ہوئی آغوش کے اندر بھینچے جانے سے انکار نہ فرمائیں۔ ایسی ظالم سوسائیٹی جو اتنے اچھے کام کو بُرا کہتی ہے، ہرگز اسکی مستحق نہیں کہ اس سے ڈرا جائے، اور یہ کارِ خیر انجام دے کر اس سے

منہ چھپایا جائے۔ نہیں، ہر لڑکی کو علانیہ اور بیباکانہ اس فضیلت اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور خود شرمندہ ہونے کے بجائے، ہو سکے تو الٹا سوسائٹی کو شرمندہ کرنا چاہیے ـــــ یہ جرأت و جسارت کبھی بازار میں بیٹھنے والی بیسواؤں کو بھی نصیب نہ تھی، کیونکہ اُن بدنصیبوں کے پاس ایسا فلسفۂ اخلاق نہ تھا جو گناہ کو صواب اور صواب کو گناہ کر دیتا۔ اُس وقت کی بیسوا عصمت تو بیچتی تھی مگر اپنے آپ کو خود ذلیل اور گناہگار سمجھتی تھی۔ مگر اب یہ نیا ادب ہر گھر کی بہو اور بیٹی کو پہلے زمانہ کی بیسواؤں سے بھی دس قدم آگے پہنچا دینا چاہتا ہے کیونکہ یہ بدمعاشی و فحش کاری کی پشتیبانی کے لیے ایک نیا فلسفۂ اخلاق پیدا کر رہا ہے۔

ایک اور رسالہ میں، جسکو ہمارے ملک کے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے، ایک افسانہ "دیور" کے عنوان سے شائع ہوا ہے ـــــ مصنف ایک ایسے صاحب ہیں جنکے والد مرحوم کو عورتوں کے لیے بہترین اخلاقی لٹریچر پیدا کرنے کا شرف حاصل تھا، اور اسی خدمت کی وجہ سے غالباً وہ ہندوستان کی اردو خواں عورتوں میں مقبول ترین بزرگ تھے ـــــ اس افسانہ میں نوجوان ادیب صاحب ایک ایسی لڑکی کے کیرکٹر کو خوشنما بنا کر اپنی بہنوں کے لیے نمونہ کے طور پر پیش فرماتے ہیں جو شادی سے پہلے ہی اپنے "دیور کی بھرپور جوانی اور شباب کے ہنگاموں" کا خیال کر کے "اپنے جسم میں تھرتھری" پیدا کر لیا کرتی تھی، اور کنوارپنے ہی میں جس کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ "جو جوانی خاموش اور پرسکون گذر جائے اُس میں اور ضعیفی میں کوئی فرق نہیں میرے نزدیک تو جوانی کے لیے ہنگامے ضروری ہیں جنکا ماخذ کشمکش حسن و عشق ہے"۔ اس نظریہ اور ان ارادوں کو لیے ہوئے جب یہ صاحبزادی بیاہی گئیں تو اپنے ڈاڑھی والے شوہر کو دیکھ کر ان کے جذبات پر اُوس پڑ گئی" اور انہوں نے پہلے سے سوچے ہوئے نقشے کے مطابق فیصلہ کر لیا کہ اپنے شوہر کے حقیقی بھائی سے دل لگائینگی۔ چنانچہ بہت جلدی اسکا موقع آگیا۔ شوہر صاحب حصول تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے اور انکے پیچھے بیوی نے شوہر کی اور بھائی نے بھائی کی خوب دل کھول کر اور مزے لے لے کر خیانت کی۔ مصنف نے اس کارنامے کو خود اُس مجرمہ کے قلم سے لکھا ہے۔ وہ اپنی ایک سہیلی کو جسکی ابھی شادی نہیں

ہوئی ہے، اپنے تمام کرتوت آپ اپنے قلم سے لکھ کر بھیجتی ہے، اور وہ تمام مراحل پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے جن سے دیور اور بھاوج کی یہ آشنائی گذر کر آخری مرحلہ تک پہنچی۔ قلب اور جسم کی جتنی کیفیات صنفی اختلاط کی حالت میں واقع ہوسکتی ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی بیان کرنے سے وہ نہیں چوکتی۔ بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ فعل مباشرت کی تصویر نہیں کھینچی گئی۔ شائد اس کوتاہی میں بھی یہ بات مدنظر ہوگی کہ ناظرین وناظرات کا تخیل تھوڑی سی زحمت اٹھا کر خود ہی اسکی خانہ پُری کرلے!

اس نئے ادب کا اگر فرانس کے اُس ادب سے مقابلہ کیا جائے جسکے چند نمونے ہم نے اس سے پہلے پیش کیے ہیں تو صاف نظر آجائیگا کہ یہ قافلہ اُسی راستے سے اُسی منزل کی طرف جارہا ہے۔ اسی نظام زندگی کے لیے ذہنوں کو نظری اور اخلاقی حیثیت سے تیار کیا جارہا ہے، اور عنانِ توجہ خاص طور پر عورتوں کی طرف منعطف ہے تاکہ انکے اندر حیا کی ایک رمق بھی باقی نہ چھوڑی جائے۔

تمدن جدید| یہ فلسفۂ اخلاق اور یہ نظریۂ زندگی میدان میں اکیلا نہیں ہے۔ اسکے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام تمدن، اور مغربی جمہوریت کے اصول بھی برسرِکار آگئے ہیں، اور یہ تینوں طاقتیں مِل جُل کر زندگی کا وہی نقشہ بنارہی ہیں جو مغرب میں بن چکا ہے۔ صنفیات پر بدترین قسم کا فحش لٹریچر شائع کیا جارہا ہے جو مدرسوں اور کالجوں کے طالبین وطالبات تک کثرت سے پہنچتا ہے۔ عریاں تصویریں اور آبرو باختہ عورتوں کی شبیہیں ہر اخبار، ہر رسالے، ہر گھر اور ہر دوکان کی زینت بن رہی ہیں۔ گھر گھر اور بازار بازار گراموفون کے وہ ریکارڈ بج رہے ہیں جن میں نہایت رکیک اور گندے گیت بھرے جاتے ہیں سینما کا سارا کاروبار جذبات شہوانی کی انگیخت پر چل رہا ہے، اور پردۂ سیمیں پر فحش کاری و بے حیائی کو ہر شام اتنا مزین بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ ہر لڑکی اور لڑکے کی نگاہ میں ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی زندگی اسوۂ حسنہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ان شوق پرور وتمنا آفریں کھیلوں کو دیکھ کر دونوں صنفوں کے نوجوان جب تماشاگاہ سے نکلتے ہیں تو انکے بے چین دلولے ہر طرف عشق اور رومان کے مواقع ڈھونڈھنے لگتے ہیں

یہ سب سرمایہ دارانہ انتفاع کی مختلف شکلیں ہیں۔ اسی سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی بدولت بڑے شہروں میں وہ حالات تیزی کیساتھ پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں جن میں عورتوں کے لیے اپنی روزی آپ کمانا ناگزیر ہوتا جاتا ہے۔ اور اسی ظالمانہ نظام کی مدد پر منع حمل کا پروپیگنڈا، اپنی دواؤں اور اپنے آلات کے ساتھ میدان میں آگیا ہے۔

جدید جمہوری نظام نے جسکی برکات زیادہ تر انگلستان اور فرانس کے توسط سے مشرقی ممالک تک پہنچی ہیں، ایکطرف عورتوں کے لیے سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کے راستے کھول دیے ہیں، دوسری طرف ایسے ادارات قائم کیے ہیں جن میں عورتوں اور مردوں کے خلط ملط ہونے کی صورتیں لازماً پیدا ہوتی ہیں، اور تیسری طرف قانون کی بندشیں اتنی ڈھیلی کردی ہیں کہ فواحش کا اظہار ہی نہیں بلکہ عملی ارتکاب بھی اکثر و بیشتر حالات میں جرم نہیں ہے۔

ان حالات میں جو لوگ پورے انشراح قلب کے ساتھ زندگی کے اس راستے پر جانیکا فیصلہ کرچکے ہیں، اُنکے اخلاقیات اور انکی معاشرت میں قریب قریب مکمل انقلاب واقع ہوگیا ہے۔ انکی خواتین اب ایسے لباسوں میں نکل رہی ہیں کہ ہر عورت پر فلم ایکٹریس کا دھوکا ہوتا ہے۔ انکے اندر پوری بیباکی پائی جاتی ہے، بلکہ لباس کی عریانی، رنگوں کی شوخی، بناؤ سنگھار کے اہتمام، اور ایک ایک ادا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صنفی مقناطیس بننے کے سوا کوئی دوسرا مقصد ان خواتین کے پیش نظر نہیں ہے۔ حیا کا عالم یہ ہے کہ غسل کا لباس پہن کر مردوں کے ساتھ نہانا حتیٰ کہ اس حالت میں اپنے فوٹو کھنچوانا اور اخبارات میں شائع کرادینا بھی اس طبقہ کی کسی شریف خاتون کے لیے موجب شرم نہیں ہے۔ بلکہ شرم کا سوال وہاں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جدید اخلاقی تصورات کے لحاظ سے انسانی جسم کے سب حصے یکساں ہیں۔ اگر ہاتھ کی ہتھیلی اور پاؤں کے تلوے کو کھولا جاسکتا ہے تو آخر کیوں ران اور بن پستان کو کھول دینے میں کیا مضائقہ ہے؟ زندگی کا لطف، جسکے مظاہر کا مجموعی نام آرٹ ہے، ان لوگوں کے نزدیک ہر اخلاقی قید سے بالاتر بلکہ بجائے خود معیار اخلاق ہے۔ اسی بنا پر باپ اور بھائی اُسوقت فخر و مسرت کے مارے پھولے نہیں سماتے جب انکی آنکھوں کے سامنے کنواری بیٹی اور بہن اسٹیج پر موسیقی اور رقص اور عشق عاشقانہ اداکاری کے کمالات دکھا کر سینکڑوں پُرجوش ناظرین و سامعین سے دادِ تحسین حاصل کرتی ہے۔ مادی کامیابی جس کا دوسرا نام مقصدِ زندگی ہے، انکی رائے میں ہر اس ممکن چیز سے زیادہ قیمتی ہے جسے قربان کرکے یہ شے حاصل کی جاسکتی ہو

جس لڑکی نے اس گوہرِ مقصود کے حصول کی قابلیت اور سوسائٹی میں مقبول ہونے کی لیاقت بہم پہنچالی اُس نے اگر عصمت کھودی تو گویا کچھ بھی نہ کھویا، بلکہ سب کچھ پالیا۔ اسی بنا پر یہ بات کسی طرح انکی سمجھ میں آتی ہی نہیں کہ کسی لڑکی کا لڑکوں کیساتھ مدرسے یا کالج میں پڑھنا، یا عالمِ جوانی میں تنہا حصول تعلیم کے لیے یورپ جانا آخر کیوں قابلِ اعتراض ہو۔

مستغربین سے فیصلہ یہ ہیں وہ لوگ جو پردے پر سب سے بڑھ کر اعتراض کرتے ہیں۔ انکے نزدیک پردہ ایسی ایک حقیر بلکہ بدیہی البطلان چیز ہے کہ اسکی تضحیک کردینا اور اس پر پھبتیاں کس دینا ہی اسکی تردید کے لیے کافی دلیل ہے۔ لیکن ان کا یہ رویہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص انسانی چہرے پر سرے سے ناک کی ضرورت ہی کا قائل نہ ہو، اور اس بنا پر وہ ہر اس شخص کا مذاق اڑانا شروع کردے جسکے چہرے پر اسے ناک نظر آئے۔ اس قسم کی جاہلانہ باتوں سے صرف جاہل ہی مرعوب ہو سکتے ہیں۔ انکو، اگر انکے اندر کوئی معقولیت موجود ہے، یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے اور انکے درمیان دراصل قدروں کا بنیادی اختلاف ہے۔ جن چیزوں کو ہم قیمتی سمجھتے ہیں وہ ان کے نزدیک بے قیمت ہیں، لہٰذا اپنے معیار قدر کے لحاظ سے جس طرزِ عمل کو ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ لامحالہ انکی نگاہ میں قطعاً غیر ضروری بلکہ مہمل ٹھیرنا ہی چاہیے۔ مگر ایسے بنیادی اختلاف کی صورت میں وہ صرف ایک خفیف العقل آدمی ہی ہو سکتا ہے جو اصل بنائے اختلاف پر گفتگو کرنے کے بجائے فروع پر حملہ شروع کردے۔ انسانی قدروں کے تعین میں فیصلہ کن چیز اگر کوئی ہے تو وہ قوانین فطرت ہیں۔ قوانین فطرت کے لحاظ سے انسان کی ساخت جس چیز کی مقتضی ہو، اور جس چیز میں انسان کی صلاح اور فلاح ہو، وہی دراصل قدر کی مستحق ہے۔ آؤ، اس معیار پر جانچ کر دیکھ لیں کہ قدروں کے اختلاف میں ہم راستی پر ہیں یا تم ہو۔ علمی دلائل جو کچھ تمہارے پاس ہیں انہیں لے آؤ، اور جو دلائل ہم رکھتے ہیں، انہیں ہم پیش کرتے ہیں۔ پھر راستبازا اور ذی عقل انسانوں کی طرح دیکھو کہ وزن کس طرف ہے۔ اس طریقہ سے اگر ہم اپنے معیارِ قدر کو صحیح ثابت کردیں، تو تمہیں اختیار ہے، چاہے ان قدروں کو قبول کرو جو خالص علم اور عقل پر مبنی ہیں، چاہے اپنی قدروں کے پیچھے پڑے رہو جنہیں مجرد نفسانی رجحان کی بنا پر تم نے پسند کیا ہے۔ مگر اس دوسری صورت میں تمہاری اپنی پوزیشن اس قدر کمزور رہ جائیگی کہ ہمارے طرزِ عمل کی تضحیک کرنے کے بجائے تم خود تضحیک کے مستحق بن کر رہ جاؤ گے۔

دوسرا گروہ اسکے بعد ہمارے سامنے دوسرا گروہ آتا ہے۔ پہلے گروہ میں تو غیر مسلم اور نام نہاد مسلمان، دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں۔ مگر یہ دوسرا گروہ تمام تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ان لوگوں میں آجکل نیم حجابی اور نیم بے حجابی کی ایک عجیب معجون مرکب استعمال کی جارہی ہے۔ یہ مذبذبین بین ذٰلك لا الی ھٰؤلاء و لا الی ھٰؤلاء کے صحیح مصداق ہیں۔ ایک طرف تو یہ اپنے اندر اسلامی جذبات رکھتے ہیں۔ اخلاق، تہذیب، شرافت اور حسن سیرت کے ان معیاروں کو مانتے ہیں جنکو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اپنی عورتوں کو حیا اور عصمت کے زیوروں سے آراستہ اور اپنے گھروں کو اخلاقی نجاستوں سے پاک رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اور ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو مغربی تمدن و معاشرت کے اصولوں کی پیروی سے رونما ہوئے ہیں اور رونما ہو رہے ہیں۔ مگر دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے اصول و قوانین کو توڑ کر کچھ رکتے، کچھ جھجکتے اسی راستہ کی طرف اپنی بیویوں، بہنوں، اور بیٹیوں کو لیے چلے جا رہے ہیں جو مغربی تہذیب کا راستہ ہے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ آدھے مغربی اور آدھے اسلامی طریقوں کو جمع کرکے یہ دونوں تہذیبوں کے فوائد و منافع اکٹھے کر لینگے۔ یعنی انکے گھروں میں اسلامی اخلاق بھی محفوظ رہینگے، انکی خاندانی زندگی کا نظم بھی برقرار رہیگا، اور اسکے ساتھ انکی معاشرت اپنے اندر مغربی معاشرت کی برائیاں نہیں بلکہ صرف اسکی دلفریبیاں، اسکی لذتیں اور اسکی مادی منفعتیں جمع کرے گی۔ لیکن اول تو دو مختلف الاصل اور مختلف المقصد تہذیبوں کی آدھی آدھی شاخیں کاٹکر پیوند لگانا ہی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح کے بے جوڑ امتزاج سے دونوں کے فوائد جمع ہونے کے بجائے دونوں کے نقصانات جمع ہو جانا زیادہ قریب از قیاس ہے۔ دوسرے یہ بھی خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہے کہ ایک مرتبہ اسلام کے مضبوط اخلاقی نظام کی بندشیں ڈھیلی کرنے اور نفوس کو قانون شکنی سے لذت آشنا کر دینے کے بعد آپ اس سلسلہ کو اسی حد پر روک رکھینگے جسکو آپنے خالی از مضرت سمجھ رکھا ہے۔ یہ نیم عریاں لباسوں کا رواج، یہ زینت و آرائش کا شوق، یہ دوستوں کی محفلوں میں بیباکی کے ابتدائی سبق، یہ سینما اور برہنہ تصویروں اور عشقی افسانوں سے بڑھتی ہوئی دلچسپی، یہ مغربی ڈھنگ پر لڑکیوں کی تعلیم، بہت ممکن ہے کہ اپنا فوری اثر نہ دکھائے، بہت ممکن ہے کہ موجودہ نسل اسکی مضرتوں سے محفوظ رہ جائے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ آئندہ نسلیں بھی اس سے محفوظ رہیں گی ایک صریح نادانی ہے۔ تمدن اور معاشرت میں ہر غلط طریقہ کی ابتدا بہت معصوم ہوتی ہے۔ مگر ایک نسل سے دوسری نسل اور دوسری سے تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے وہی چھوٹی سی

ابتدا ایک خوفناک غلطی بن جاتی ہے - خود یورپ اور امریکہ میں بھی جن غلط بنیادوں پر معاشرت کی تنظیم جدید کی گئی تھی اسکے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اسکے پورے پورے نتائج اب تیسری اور چوتھی پشت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ پس یہ مغربی اور اسلامی طریقوں کا امتزاج اور یہ نیم بے حجابی دراصل کوئی مستقل اور پائدار چیز نہیں ہے۔ دراصل اسکا فطری رجحان انتہائی مغربیت کی طرف ہے اور جو لوگ اس طریقہ پر چل رہے ہیں انکو سمجھ لینا چاہیے کہ انہوں نے فی الحال اُس سفر کی ابتدا کی ہے جسکی آخری منزلوں تک اگر وہ نہیں تو انکی اولاد اور اولاد کی اولاد پہنچ کر رہیگی۔

فیصلہ کن سوال ایسی حالت میں قدم آگے بڑھانے سے پہلے ان لوگوں کو خوب غور و خوض کر کے ایک بنیادی سوال کا فیصلہ کر لینا چاہیے جو مختصراً حسب ذیل ہے:

کیا آپ مغربی معاشرت کے اُن نتائج کو قبول کرنیکے لیے آمادہ ہیں جو یورپ اور امریکہ میں رونما ہو چکے ہیں، اور جو اس طرزِ معاشرت کے طبعی اور یقینی نتائج ہیں؟ کیا آپ اسکو پسند کرتے ہیں کہ آپکی سوسائٹی میں بھی وہی ہیجان انگیز اور شہوانی ماحول پیدا ہو؟ آپکی قوم میں بھی اسیطرح بے حیائی، بے عصمتی، اور فواحش کی کثرت ہو؟ امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں؟ خاندان اور گھر کا نظام درہم برہم ہو جائے؟ طلاق اور تفریق کا زور ہو؟ نوجوان مرد اور عورتیں آزادانہ شہوت رانی کی خوگر ہو جائیں؟ منع حمل اور اسقاط حمل اور قتل اولاد سے نسلیں منقطع کیجائیں؟ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی شہوانیت میں اپنی بہترین عملی قوتوں کو ضائع اور اپنی صحتوں کو برباد کریں؟ حتی کہ کمسن بچوں تک میں قبل از وقت صنفی میلانات پیدا ہونے لگیں اور اس سے انکے دماغی و جسمانی نشوونما میں ابتدا ہی سے فتور برپا ہو جایا کرے؟

اگر مادّی منفعتوں اور حسّی لذتوں کی خاطر آپ ان سب چیزوں کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں تو بلا تامل مغربی راستے پر تشریف لے جائیے اور اسلام کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لائیے۔ اس راستہ پر جانے سے پہلے آپکو اسلام سے قطع تعلق کا اعلان کرنا پڑیگا تاکہ آپ بعد میں اس نام کو استعمال کر کے کسی کو دھوکا نہ دیسکیں، اور آپکی رسوائیاں اسلام اور مسلمانوں کے لیے موجبِ ننگ و عار نہ بن سکیں۔

لیکن اگر آپ ان نتائج کو قبول کرنیکے لیے تیار نہیں ہیں، اگر آپکو ایک ایسے صالح اور پاکیزہ تمدن کی ضرورت ہے جس میں اخلاق فاضلہ اور ملکات شریفہ پرورش پاسکیں جس میں انسان کو اپنی عقلی اور روحانی اور مادّی ترقی کے لیے ایک پرسکون ماحول

مل سکے، جسمیں عورت اور مرد بھی جذبات کی خلل اندازی سے محفوظ رہ کر اپنی بہترین استعداد کے مطابق اپنے اپنے تمدنی فرائض انجام دے سکیں، جسمیں تمدن کا سنگ بنیاد یعنی خاندان پورے استحکام کیساتھ قائم ہو، جسمیں نسلیں محفوظ رہیں اور اختلاط انساب کا فتنہ برپا نہ ہو، جسمیں انسان کی خانگی زندگی اسکے لیے سکون و راحت کی جنت اور اسکی اولاد کے لیے شفقت و تربیت کا گہوارہ اور خاندان کے تمام افراد کے لیے اشتراک عمل اور امداد باہمی کی انجمن ہو، تو ان مقاصد کے لیے آپکو مغربی راستہ کا رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ بالکل مخالف سمت کو جارہا ہے اور مغرب کی طرف چل کر مشرق کو پہنچ جانا عقلاً محال ہے۔ اگر فی الحقیقت آپکے مقاصد یہی ہیں تو آپکو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

مگر اس راستہ پر قدم رکھنے سے پہلے آپکو ان غیر معتدل مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کی طلب اپنے دل سے نکالنی ہوگی جو مغربی تمدن کے دلفریب مظاہر کو دیکھکر پیدا ہوگئی ہے۔ اُن نظریات اور تخیلات سے بھی اپنے دماغ کو خالی کرنا ہوگا جو یورپ سے آپنے مستعار رکھے ہیں۔ ان تمام اصولوں اور مقصدوں کو بھی طلاق دینا پڑیگا جو مغربی تمدن و معاشرت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اسلام اپنے الگ اصول اور مقاصد رکھتا ہے اسکے اپنے مستقل عمرانی نظریات ہیں۔ اس نے ویسا ہی ایک نظام معاشرت وضع کیا ہے جیسا کہ اسکے مقاصد اور اسکے اصول اور اسکے عمرانی نظریات کا طبعی اقتضا ہے۔ پھر اس نظام معاشرت کا تحفظ وہ ایک خاص ڈسپلن اور ایک خاص ضابطہ کے ذریعہ سے کرتا ہے جسکے مقرر کرنے میں غایت درجہ کی حکمت اور نفسیات انسانی کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، جسکے بغیر یہ نظام معاشرت اختلال و برہمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ افلاطون کی جمہوریت کیطرح کوئی خیالی اور وہمی نظام (Utopia) نہیں ہے، بلکہ ساڑھے تیرہ صدیوں کے زبردست امتحان میں پورا اتر چکا ہے اور اس طویل مدت میں کسی ملک اور کسی قوم کے اندر بھی اسکے اثر سے ان خرابیوں کا عشر عشیر بھی رونما نہیں ہوا ہے جو مغربی تمدن کے اثر سے صرف ایک صدی کے اندر پیدا ہو چکی ہیں۔ پس اگر اس محکم اور آزمودہ نظام معاشرت سے آپ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آپکو اسکے ضابطہ اور اسکے ڈسپلن کی پوری پوری پابندی کرنی ہوگی، اور یہ حق آپکو ہرگز حاصل نہ ہوگا کہ اپنی عقل سے نکالی ہوئی یا دوسروں سے سیکھے ہوئے نیم پختہ خیالات اور غیر آزمودہ طریقوں کو، جو اس نظام معاشرت کی طبیعت اور اسکے مزاج کے بالکل خلاف ہوں، خواہ مخواہ اس میں ٹھونسنے کی کوشش کریں۔

تیسرا گروہ چونکہ سفہاء اور مغفلین پر مشتمل ہے جن میں خود سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے لہٰذا وہ کسی توجہ کا مستحق نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھیں۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عہ ۱۰	صہ ۲۵	للعہ ۴۵	لتہ
نصفِ صفحہ	ے ۶	صہ ۱۵	صہ ۲۵	للعہ ۴۵
رُبع صفحہ	للعہ ۴	عہ ۱۰	معہ ۱۷	صہ ۲۵

۱۔ کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصُول ہونی ضرُوری ہے۔

۳۔ صِرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائٹیل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمِ جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظامِ تمدن میں روحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حصّہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب' بودھ مت' یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلیئے لکھا گیا ہے- اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے- مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عمُوماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علمأ بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰/ محصُول ڈاک ۲/ خرچ وی پی ۳/

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

سوہنی و تصاویر پرن پریس [illegible] میں طبع ہوتے